

نگار

ادبیر: نیاز فچوری

جلد	فہرست مضامین اپریل ۱۹۴۲ء	شمار
ملاحظات	۱	۲۴
نوسٹرا ڈاس کی عجیب و غریب پیشگوئیاں	۴	۳۸
ماسکو کی خونیں تاریخ	۷	۴۰
مشہور شاعر، گننام خزل گو	۹	۴۳
پورب اور کچھم	۱۶	۴۶
نقد پر نقد		
خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر		
باب المراسلہ والمناظرہ		
مکتوبات نیاز		
وقت کی باتیں		
منظومات		
مرزا جعفر علی خاں اثر فضل الدین اثر پروفیسر شورشہر ترمذی۔ ماہر القادری		

ملاحظات

جاپان کے آئندہ اقدامات

اس میں شک نہیں لڑائی بڑی دلچسپ چیز ہے بشرط آنکہ ایک غیر ذمہ دار تماشائی کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا موقع ہم کو ملے، لیکن وہ اتنی ہی زیادہ دہشت انگیز بھی ہے، اگر ہماری حیثیت ایک فریق کی سی ہو جائے اور میری رائے میں جمہور کی یہی نفسیاتی کیفیت جنگ کے امتداد و شداید کا باعث ہوا کرتی ہے جب تک ہم کو یقین تھا کہ یہ جنگ ”تہر یورپ بر جان یورپ“ سے زیادہ نہیں، باوجود تمام اُن اقتصادی دشواریوں کے، جو ہندوستان کو برطانوی علاقہ ہونے کی حیثیت سے برداشت کرنا پڑ رہی تھیں، ہم پریشان نہ تھے لیکن اب کہ یہ آگ چارے دروازہ تک پہنچ گئی ہے، سرسنگی کا یہ عالم ہے، گویا جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا اور اب ہمارے خاموشی سے جان دینے کے علاوہ کوئی صورت ہی باقی نہیں، حالانکہ اگر ہم نے پہلے اس لڑائی کو صرف یورپ کی چیز سمجھ کر کوئی جذبی بندر دی یہ دیا نہیں کیا تھا تو بھی غلطی نہ تھی اور اب کہ اس کے شعلے ہمارے دامن تک پہنچ چکے ہیں، اپنے آپ کو مشیت یا قسمت کے حوالہ کر دینا دوسری غلطی ہوگی۔ موجودہ زمانہ میں، جبکہ علوم کی ترقی اور وسیع وسیع ذرائع مطالعہ نے زمین کے ۲۴ ہزار میل کے محیط کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ ریڈیو کی ہر ایک سکند میں پانچ مرتبہ کرہ زمین کا چکر لگا لیتی ہے، مشرق و مغرب، یا شمال و جنوب کے بعد کا کوئی سوال باقی نہیں رہا اور ساری دنیا نفع اندوزی میں نہیں، نو نر و نقصان کے باب میں ضرور ایک غیر منقسم وحدت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ پھر اگر ہم اپنی نگاہ کو وسیع کر کے رنگ و نسل کے امتیاز سے قطع نظر صرف انسانیت کو سامنے رکھیں، تو بھی ہم کو سمجھنا چاہئے تھا کہ بے تعلق رہنے کی حالت میں بھی ہم اس جنگ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے اور اب تو خیر، وہ ایک ایسی حقیقت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے کہ کسی حجت و استدلال کی ضرورت ہی باقی نہیں!

پچھلے مہینے ہم نے سنگاپور کے سقوط کی خبر دیتے ہوئے، اُن امکانات سے بحث کی تھی جو حجاز و ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اب اگر کوئی بھی دشمنی کے قبضہ میں چلا گیا

ہے اور جزیرہ جادو بھی، یہ امکانات بہت کچھ تیغنا میں تبدیل ہو گئے ہیں اور جاپان کے یہ تین کامیاب اقدامات نہایت ہی ہولناک خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ لوگوں کے شمال کی طرف جاپانی فوجوں کی پیش قدمی کی رفتار وہ نہیں ہے، جو ملایا میں پائی جاتی تھی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس وقت چینی و برطانوی فوجوں کے اشتراک نے، جاپان کے سامنے کافی مشکلات حائل کر دی ہیں، لیکن اگر آپ نے نقشہ دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے تو آپ سمجھ سکیں گے کہ برما کی سر زمین میں قابلِ مروت وہ علاقہ باقی رہ گیا ہے جو دریائے ارادی کے مشرق میں مانڈے تک وسیع ہے، اور چونکہ ٹانگو اور پروم تک جاپانی فوجیں پہنچ ہی چکی ہیں، اس لئے یہ علاقہ ڈھائی سو میل سے زیادہ لمبا نہیں ہے اور اگر جاپانی قبضہ مانڈے پر ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ برما کا پٹرول بھی برطانوی قبضہ سے گیا اور برما کی جنگ بھی تقریباً انجام کو پہنچ گئی۔ اس کے بعد بالائی برما اور مغربی حصہ کا سوال رہ جائے گا، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کوہستانی علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت دشوار گزار ہے اور جہاں شرقاً غرباً سارے محاذ پر برطانوی فوجیں نہایت مضبوطی کے ساتھ راستہ روکے ہوئے ہیں

ہو سکتا ہے کہ یہ موانع جاپانی کامیابیوں کو دشوار بنادیں، لیکن چونکہ خود برقی قوم کا ایک حصہ جاپان کے ساتھ ہو گیا ہے، اس لئے ایسی صورت میں جو مقامی دشواریاں برطانوی حکومت کو ہونا چاہئے، اُن کا فائدہ یقیناً جاپان کو پہنچے گا لیکن صرف برما کے انجام کو اس جنگ کا انجام سمجھنا یقیناً غلطی ہوگی، کیونکہ اب تو امریشہ یہ ہے کہ کہیں یہ آگ ہندو سواحل ہند سے گزر کر اور آگے نہ بڑھے!

جاپان کے آئندہ ارادوں کے متعلق لوگوں میں اب زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا اور یہ بات روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت نہ صرف آسٹریلیا اور ہندوستان دونوں طرف اقدام کرنا چاہتا ہے بلکہ افریقہ کے جنوب میں مڈگاسکر تک پہنچ کر وہ اتنا بڑا گھیراؤ بنا چاہتا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ افریقہ اور اٹل ایسٹ بھی معاہدہ ایران کے اس کے اندر آجائے اور اس طرح جاپانی اور نازی فوجیں کسی مقام پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا سکیں۔ اس لئے اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اس کے یہ اقدامات کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

آپ بحرِ ہند کے نقشہ اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ٹوکیو سے لیکر سنگاپور تک اور زنگین سے لیکر آسٹریلیا تک جو رقبہ محاذ جنگ بنا ہوا ہے وہ روس و جرمنی کے محاذ سے دو چندان ہے اور اگر اس میں بحرِ ہند اور جنوبی افریقہ کے اُس حصے کو بھی شامل کر لیا جائے جہاں مڈگاسکر واقع ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً آدھی دنیا کو محاذ بنا کر جاپان جنگ کرنا چاہتا ہے اور یہ اتنا بڑا ارادہ ہے کہ اس سے قبل جاپان کیا، دنیا کی کوئی سلطنت ایسی جرأت نہیں کر سکی

یہ درست ہے کہ جاپان کی بحری قوت زبردست ہے، یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی طاقت اب تک محفوظ چلی آرہی تھی، تاہم یہ دعویٰ تو غالباً جاپان بھی نہیں کر سکتا کہ اس وقت تک جو کامیابیاں اسے بحرِ الکاہل (پاسفک) میں ہوئی ہیں، اُن میں اسے جان و مال کا کوئی نقصان ہی نہیں ہوا، اس لئے اگر وہ واقعی ٹوکیو سے لیکر مڈگاسکر تک اور برما سے لیکر آسٹریلیا و نیوگنی تک ہر جگہ مسلط ہونا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اسے زیادہ نہیں، صرف اتنا ہی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، جتنا وہ اس وقت تک اٹھا چکا ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ وہ الیکار شاید اپنے ارادہ میں کامیاب تو ہو جائے، لیکن اس کامیابی کی عمریت گریز پائیت ہوگی۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ ہم برطانیہ اور امریکہ دونوں کو بالکل مضبوط سمجھ کر یہ فرض کر لیں کہ آئندہ بھی اسے ایسی ہی آسان کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں گی جیسی اس وقت تک اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ امریکہ و برطانیہ اپنی جارحانہ طیاریاں مکمل کر چکے ہیں اور شاید مستقبل قریب میں ان کی پوزیشن بجائے مافقت کرنے کے حملہ کرنے کی ہو جائے گی، تو پھر جاپان کے اتنے بڑے ارادہ کا حشر واضح ہے

جس طرح دنیا کی ہر آگ کے لئے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح لڑائی کی آگ کو بھی ایندھن درکار ہوتا ہے اور اس ایندھن میں آج کل صرف انسان ہی شامل نہیں ہیں بلکہ پٹرول، لوہا، کوئلہ، سونا، چاندی اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جاپان کو نہ صرف اس ایندھن بلکہ اس کے حمل و نقل کا بھی انتظام کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایک طرف دھراتر میں ہندوستان کی طرف اور دوسری طرف دھرتکھن میں آسٹریلیا کی جانب ہر وقت ضرورت کے مطابق، فوج اور سامان بھیجے رہنا کوئی معمولی بات نہیں

حقیقت سے انکار نہ کیا جائے کہ جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کر سکتا، لیکن یہ بات ضرور حقیقت سے قریب ہے کہ اتنے بڑے ملک کو سر کرنا مفتوحہاں طے کرنے سے کم نہیں، اور اگر ایک بار یہاں اس کی گہری الجھ گئی تو شاید قبضہ سے زیادہ تلخ تجربات سے اسے دوچار ہونا پڑے

یہ درست ہے کہ فوجی آراستگی کے لحاظ سے آسٹریلیا کی حالت ہندوستان سے بہتر ہے، اور چونکہ اسے امریکہ اور انگلستان سے بھی مدد پہنچ سکتی ہے، اس لئے

اسکی قیمت کا فیصد شاید اتنی جلد نہ ہوگا جس قدر جلد جاؤا کا ہوا، لیکن ہندوستان باوجود اس کے کہ وہ نہ تھا ہے، باوصف اس کے کہ یہاں کی رعایا کو سوائے اینٹ پتھر دکان کے اپنی حفاظت کا کوئی اور طریقہ معلوم نہیں، اس کا قومی مزاج بالکل بدل چکا ہے اور وہ جاپان کی کسی اجنبی قوم کی حکومت قبول نہیں کر سکتا، یعنی اگر ہندوستان جاپانی تسلط کے خلاف تیغ و تفنگ سے کام نہیں لے سکتا، تو وہ اپنی روحانی بغاوت سے کام لیکر اسے یہاں چین سے بیٹھے بھی نہیں دے گا اور یہ اتنا بڑا سیاسی دباؤ ہوگا جس کے بوجھ کو وہ کیا کوئی بھی عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتا

جاپان سمجھتا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ تمام برطانوی ذرائع کے سرچشموں کو خشک کر دے اور شاید اسی لئے وہ سنگاپور سے ڈکا سکرنگ ایک آتشیں خط برطانیہ کی راہ میں حائل کر دینا چاہتا ہے تاکہ بحر روم اور مشرق وسطیٰ کی طرف سے کوئی مدد ہندوستان کو نہ پہنچ سکے لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب ڈل ایسٹ اور ہندوستان کے خشکی کے راستوں کو بھی بند کر دیا جائے اور شاید اسی لئے بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ ممکن ہے اب جرمنی ڈل ایسٹ کی طرف بڑھے کیونکہ جاپان کو جرمنی کی طرف سے مدد پہنچنے کی طرف ہی ایک صورت ہے

بہر جاپان، ہندوستان پر فوری حملہ کرے یا نہ کرے، لیکن ہندوستان خطرہ کی زد میں ضرور آگیا ہے اور اگر اس دوران میں امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے پاسفک میں جارحانہ حملے شروع ہو گئے، تو اس خطرہ کا واقعہ کی صورت اختیار کر لینا یقینی سمجھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جاپان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اسکی صورت کیا ہوگی۔ بظاہر اس کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ برما کی طرف سے براہ خشکی حملہ کرے، دوسری یہ کہ سواحل ہند پر وہ پانی کے راستے سے اپنی فوجیں اتارے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک وقت دونوں صورتیں اختیار کرے گا۔ ہر چند بحر ہند میں برطانوی قوت سنگاپور کے نکل جانے سے کافی کمزور ہو گئی ہے، لیکن اگر جاپان نے میلون یا درآس یا خلیج بنگال کی طرف سے حملہ کیا جس کا رنگون اور جاوا پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے قوی امکان ہے، تو برطانیہ کی ہوائی طاقت جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت میں کافی موانع پیدا کرے گی اور یہ کام اتنا آسان نہ ہوگا جتنا خیال کیا جاتا ہے، براہ خشکی کا معاملہ سو دیاں جاپان کو اور زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا، کیونکہ ہندوستان ایسے وسیع ملک کے لئے جتنی فوج اور جتنے سامان کی ضرورت ہے وہ یقیناً آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا

نیوگنی اور آسٹریلیا پر جاپان نے حملہ شروع کر دیا ہے، لیکن یہاں امریکی کمک کافی مقدار میں پہنچنے لگی ہے اور اسوقت تک کہ پاسفک کا موسم خود جاپانی مقبوضات پر بمباری کی اجازت نہ دے، یہ لڑائی بھی ٹھہر جائے گی اور ممکن ہے کہ موسم کی تبدیلی کے بعد جاپان کو اپنے جارحانہ پوزیشن میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا پڑے !

روس کا محاذ
جول جول سردی ختم ہوتی جا رہی ہے، روس کے محاذ میں بھی تغیر پیدا ہوتا جا رہا ہے اور غالباً وسط اپریل تک، روس کو اپنے موجودہ نقشہ جنگ میں تبدیلی کرنا پڑے۔ سردیوں میں روسی فوجوں نے نازی افواج کو پیچھے دھکیلنے کی بڑی کوشش کی، لیکن بحر آزو سے لیکر لینن گراڈ تک کوئی ایک اہم مقام بھی جرمنوں سے خالی نہیں کرایا جاسکا، کرچ، رستون، خارکوف اور اسمولنسک کا خط بدستور جرمن قبضہ میں ہے اور سوائے اس کے کہ کالینن اور نچوین خالی کر کے لینن گراڈ اور ماسکو کے درمیانی سلسلہ مواصلت بھر قائم کر لیا گیا ہو اور دو جاسک و کالوگا سے جرمن فوجوں کو ہٹا کر ماسکو کے محاصرہ کو کمزور کر دیا گیا ہے، کوئی قابل ذکر تغیر اس محاذ میں نہیں ہوا۔ آپ نقشہ اٹھا کر دونوں فریق کے فوجی پوزیشن کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند میل کی ایک پٹی کے جو شمال سے جنوب تک چلی گئی ہے، اور باقی تمام حصہ مغربی روس کا بدستور جرمن قبضہ میں ہے اور یقیناً روس کو ان سردیوں میں وہ کامیابی نہیں ہونی جس کی اسے اور ساری دنیا کو توقع تھی، لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ نازیوں کو اب موسم بہار میں دوسرا حملہ کرنے کے لئے بہت زیادہ قوت صرف کرنا پڑے گی اور وہ فوج جو مخصوص اس حملہ کے لئے محفوظ تھی ناکافی ثابت ہوگی، لیکن یہ حتمی یقینی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس مرتبہ اس کام کو نقل قات کی طرف ہوا اور ماسکو لینن گراڈ کے محاصرہ کا رد وائیاں صرف اس لئے جاری رکھی جائیں کہ روس، قات کی طرف اپنی پوری قوت صرف نہ کر سکے۔ اگر واقعی لڑائی نے یہ رخ اختیار کیا اور قات سے گزرنے میں نازیوں کو غیر معمولی دشواریاں پیش آئیں، جن کا قومی امکان ہے، تو ترکی کا سوال پھر ایک بار سامنے آجائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ ترکی کی غیر جانبداری کو صدر مہم پہنچے۔

ڈل ایسٹ میں اسوقت برطانوی فوجوں کا خط دفاع طبروق، سوئم، اسکندریہ اور نہر سوئز سے شروع ہو کر فلسطین، شام و موصل ہوتا ہوا ایران تک چلا گیا ہے، اس لئے اگر جرمنی نے ترکی کی طرف سے بڑھنے کا ارادہ کیا تو اسے برطانیہ کی بڑی زبردست محفوظ فوج سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور عراق و بکو کے پٹرول تک پہنچنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ بہر حال اندیشہ قومی ہے کہ اپریل سے لڑائی کی آگ پھر زیادہ شدید صورت اختیار کرے گی اور ہو سکتا ہے کہ ایشیا اور یورپ سے دو علیحدہ علیحدہ اٹھنے والے شعبے ایک دوسرے کو چھو کر، سارے کرہ ارض کو اپنی آتشیں چادر میں لپیٹ لیں۔

”نوسٹراڈامس“ کی عجیب و غریب پیشگوئیاں

نوسٹراڈامس، ایک یہودی نسل کا نجومی تھا جو فرانس کے ایک مقام پر آؤش میں پیدا ہوا تھا (۱۵۰۳ء)، اس کا اصل نام ”میکائل ڈی ناسٹری ڈیم“ تھا۔ علم و فضل کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کا انسان تھا۔ پہلے عرصہ تک طبابت کرتا رہا، اور ۴۴ سال کی عمر کے بعد اس نے الہامی قسم کی پیش گوئیاں شروع کیں جن کا مجموعہ ”*Les prophéties*“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۵۵۵ء میں شائع ہوا، اس میں سات آنے والی صدیوں کے متعلق رہائیوں کی شکل میں پیشگوئیاں درج تھیں۔ اس کے بعد ۱۵۵۵ء میں اس کا دوسرا ڈیشن شائع ہوا جس میں دس صدیوں کا حال پایا جاتا تھا۔ اس کی پیشگوئیوں کے متعلق مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کا استخراج علم نجوم کے ذریعے کیا گیا تھا اور بعض انہیں صرف مجذوب کی بڑبڑاتے ہیں، لیکن چونکہ اب بہت سی باتیں پوری ہو رہی ہیں اس لئے دنیا کو پھر اس طرے توجہ ہوئی ہے اور وہ لوگ جو موجودہ جنگ کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہیں، ان پیشگوئیوں میں بعض باتیں بہت تعجب انگیز پائیں گے۔ اس نجومی کا انتقال ۱۵۶۶ء میں ہوا تھا اور ۱۷۸۱ء میں اس کی یہ کتاب کلیسا کی طرف سے ممنوع الاشاعت قرار دی گئی تھی۔ جان کاہل نے اپنے ایک مقالہ میں اس نجومی کی ان پیشگوئیوں کا حال فنانوی انداز میں بیان کیا ہے، جس کا اقتباس حاضر ہے۔

ایک سفید ریش و بردت والا انسان، شاہ بلوط کی بوسیدہ میز پر بیٹھا ہوا ہے، بہت سے قدیم کرم خوردہ مخطوطات سامنے بکھرے ہوئے پڑے ہوئے ہیں اور ایک عمومی شمع کی زرد روشنی مکہ کی پُرانی بدرنگ سنگی دیواروں سے ٹکراتا کر میز پر پڑ رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ جو بھڑیوں کے سوا کچھ نہیں، ٹھوڑی کے نیچے ہے اور اس کی سیاہ عقاب کی سی آنکھیں مخطوطات کے نقوش کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ نقوش بہت عجیب و غریب تھے اور اتنے عجیب کہ معمولی ریاضی داں ان کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ ان نقوش کا تعلق دنیا کی آئندہ تاریخ سے تھا اور جن کو صرف یہی سمجھ سکتا تھا۔ دفعۃً نجومی اُٹھا۔ مخطوطات کو سمیٹا اور اپنے کاندھے پر چادر ڈال کر شہر لائمنس کی ایک تنگ و ناہموار گلی میں نکل گیا۔ یہ بات سولہویں صدی کی ہے۔ لوگوں نے اُسے دیکھا تو آپس میں سرکوشی کرنے لگے کہ ”ڈاکٹر نوسٹراڈامس یہی ہے، لیکن اس وقت یہ اپنی کوٹھری سے کہاں نکل پڑا۔ یہ تو کہیں باہر نہ نکلتا تھا“ یہ ٹھوڑی دور چلا کر بن ہوم کے چھاپہ خانہ میں داخل ہو گیا۔

”ڈاکٹر، تمھاری اس کتاب کو میں ضرور چھاپوں گا، کیونکہ اس میں بڑی عجیب و غریب باتیں درج ہیں اور لوگ ایسی باتیں سننے کے بڑے شائق ہوتے ہیں۔ بن ہوم نے کہا ڈاکٹر:- ”لیکن کیا تمھیں میری پیش گوئیوں کا یقین نہیں ہے؟“ بن ہوم:- ”بالکل نہیں“ ڈاکٹر:- ”خیر کوئی حرج نہیں، آج نہ سہی، کل تو یقین کر دوں گے“ اور ہوا بھی یہی کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا نہ صرف بن ہوم بلکہ اور بہت سے منکرین کو ان پیش گوئیوں پر یقین لانا پڑا۔

اس وقت تک کوئی عقلی توجیہ اس کی نہیں ہو سکی کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتیں کیوں صحیح نکلیں، لیکن چونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کا بتایا ہوا مستقبل، حال کی واقعیت میں تبدیل ہونے لگا، اس لئے دنیا کو حیرت کے ساتھ سب کچھ باور کرنا بھی پڑا اور آئندہ بھی شاید یہ سلسلہ جاری رہے گا، کیونکہ اس نے ساڑھے پانچ سو سال

کے رونما ہونے والے واقعات بتائے ہیں اور ان میں سے ابھی بہت سے ظاہر نہیں ہوئے، خاص کر یہ پیش گوئی کہ مشرق وسطیٰ میں ساری دنیا ایک زبردست طبقاتی انقلاب سے دوچار ہوگی اور اس کا نتیجہ عام تباہی و بربادی ہوگی۔

خود ڈاکٹر کی زندگی کی ابتدائی داستان بہت دردناک ہے۔ تمام یورپ میں طاعون پھیل رہا تھا اور جنوبی فرانس کا علاقہ بھی اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہر گھر سے لاش پر لاش نکل رہی ہے اور بستیوں کی بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔

معالجین کی جماعت چڑے کے کپڑے پہنے ہوئے، منہ میں ہلدی کی گرہ دبائے، نٹھنوں میں روٹی ٹھونسنے ہوئے، آنکھوں پر گھٹا ٹوپ چسپے چڑھائے۔ مرض کے دفع و علاج میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن بیدلی، بے پروائی اور بے اصولی کے ساتھ۔ البتہ ان میں ایک نوجوان ڈاکٹر، میکائیل نوسٹراڈامس ایسا ہے جو بالکل اصول کے ساتھ اس وبا کا مقابلہ کر رہا ہے، مگر دوسرے ڈاکٹر اس کی توہین و تضحیک کرتے ہیں اور وہ گھر کر باہر قصبات و دیہات کی طرف چلا جاتا ہے اور علاج میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔

اس کی ہمدردیوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے رہنے والے اسے دلی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح ۲۶ سال کی عمر میں وہ قومی ہیرو بن جاتا ہے، اسی زمانہ میں گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے اس نے شادی کر لی اور اس سے دو اولادیں بھی ہوئیں، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جب دوبارہ طاعون پھیلتا تو اس نے ساری دنیا کو نجات دلائی لیکن خود اپنی بیوی اور بچوں کو بچا سکا۔ اس واقعہ کا اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آوارہ گرد درویش بن گیا اس آوارہ گردی کے سلسلہ میں اس نے سارا یورپ چھان مارا اور جہاں گیا علم کی تلاش جاری رکھی، یہاں تک کہ بہت سے حجابات اس کی نگاہوں سے اٹھ گئے اور کامیابی کی سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی، جو ابتدائی اس کی مہمانہ پیش گوئیوں کی!

اس کی پیش گوئیاں منہوی کی صورت میں ہیں، جن سے بعض بہت مبہم اور بعض بہت صاف ہیں۔ اس شخص میں کیوں یہ صلاحیت پیدا ہوئی اس کے متعلق مختلف رائے ہیں۔ خود اس کا بیان یہ ہے کہ اس کے دادا سے بعض قدیم مصری کتبے اس کو ملے تھے اور انھیں کی مدد سے وہ پیش گوئیاں کرتا ہے، کبھی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی ولادت ایسے سیاروں کے زیر اثر ہوئی ہے کہ اس میں قدرت کی طرف سے اس کی اہلیت پیدا ہو گئی ہے۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جب قدیم زمانہ میں عبرانی مقررے بھاگے ہیں تو وہ دہاؤں کی خانقاہوں سے بعض ایسے مخطوطات بھی لائے تھے جن کا تعلق علم نجوم سے تھا، یہی مخطوطات نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے چلے آئے اور بعد کو نوسٹراڈامس تک پہنچے، بہر حال حقیقت جو کچھ کر رہی ہو، اس میں کلام نہیں کہ اس کی چند پیش گوئیاں بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئیں۔

ایک رباعی میں اس نے فرانس کے بادشاہ ہنری ثانی کو قتل کرتے ہوئے کہا کہ تو ایک شخص سے ملے گا اور اندھا ہو کر نہایت دردناک موت مرے گا۔ ہنری اول اول بہت برہم ہوا، لیکن اُسے ایک اور کاہن کا کہنا یاد آ گیا جو قریب قریب اسی کے تھا، اور اس نے اپنی بیوی کیتھرائن سے کہا کہ میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیتھرائن چونکہ خود اس قسم کی باتوں پر زیادہ اعتماد کرتی تھی اور اپنے تین لڑکوں کے مستقبل کی طرف سے فکر مند تھی، اس لئے اس نے اس کو طلب کیا۔ اس نے بادشاہ کے متعلق تو وہی کہا جو پہلے کہا تھا، اور لڑکوں کے متعلق کہا کہ تینوں تخت نشین ہوں گے چنانچہ تاریخ نے اس پیش گوئی کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا۔

انگلستان کے متعلق اس نے کہا کہ تین صدی تک یہ سلطنت بہت کامیاب رہے گی لیکن اس کے بعد لندن کی (Great Fire) اپنے بادشاہ کو قتل کر دے گی۔ چنانچہ چارلس اول کا واقعہ قتل بہت مشہور ہے۔

اس نے انقلاب فرانس، اور نیپولین کے عروج کی بھی پیش گوئی کی تھی اور اس قدر تفصیل کے ساتھ گویا وہ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ اس نے پہلی جنگ عظیم کی بھی پیش گوئی کی ہے اور لکھا کہ اس کے بعد دنیا دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ جرمنی کی جمہوریت کو ایک جرمن ڈکٹیٹر (جو جرمنی کا باشندہ نہ ہوگا) ختم کر دے گا، چنانچہ ہٹلر واقعی جرمنی کا باشندہ نہیں ہے اور اس نے وہاں کی جمہوریت کو ختم کر دیا۔

اس نے نازی بربریت اور عیسویت کے تصادم، موجودہ عہد کے اضطرابات، روم برلن فتوحات، یہودیوں کی مصیبتوں، اسلحہ کی غیر معمولی صنعت اور

نازم و کیونزم کے خلاف غریب والوں کی ناپسندیدگی اور اقوام عالم کا باہم گراختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کیونزم کی ترقی اسپین و فرانس تک پہنچ جائے گی، لیکن اس تحریک کا سردار (جس سے مراد غالباً اسٹالین ہے) ایشیا و یورپ بھر کو کیونسٹ بنانے کے ارادہ کو ترک کر دے گا۔ اس نے اسپین کی کیونسٹ جنگی کا بھی ذکر کیا ہے (جو حال ہی میں ہوئی تھی)

اس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ دنیا جنگ کے خوف میں مبتلا ہو جائے گی، لیکن اصلی لڑائی ۱۹۳۲ء میں شروع ہوگی (چنانچہ ہوئی) ۱۹۳۲ء کے متعلق اس نے لکھا کہ "جرمنی میں مختلف طبقے پیدا ہوں گے اور ایک نیا فلسفی طبقہ دیسار و ناہوگا جو موت، اور عزت سب کو ٹھکرا دے گا۔ اس جماعت کا اثر صرف جرمنی کے پہاڑوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ پریس اور پبلک بھی اس کی حمایت کریں گے۔

ان پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ بڑے ہلاکت بار پر مبنی ہوائی عفریت بھی پیدا ہوں گے جو آسمانوں سے اتر کر انسانی آباد کو خانہ برباد کر دیں گے جس سے مراد غالباً ہوائی جہاز ہیں)

اس نے بتایا ہے کہ مصیبت کا زمانہ ۱۹۳۲ء سے شروع ہوگا اور ۱۹۳۲ء تک قلم رہے گا، اس جنگ میں جرمنی، فرانس پر حملہ کرے گا اور اسپین، جرمنی کو اجازت دے گا کہ وہ کوہستان پائرینز کو اپنا فوجی مرکز قرار دے۔ لیکن انگلستان فرانس کی مدد کرے گا۔ مشرق میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان نہایت سخت زلزلے آئیں گے اور انسانی آبادی بہت تباہ ہوگی۔

اس زمانہ میں، فرانس بغاوت سے دوچار ہوگا اور عجیب دو جماعتوں میں منقسم ہو جائے گا۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان بحرہم میں ایک زبردست جنگ ہوگی جو اٹلی کے بیڑے کو بالکل تباہ کر دے گی۔ یہ حالات یا تو یورپ کو ختم کر دیں گے یا سخت انقلابات پیدا کرنے کا باعث ہوں گے، جو جرمنی اور اٹلی کو بھی گھیر لیں گے۔ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ، ایک سخت قتل عام کے بعد فرانس کی تیسری جمہوریت ختم ہو جائے گی اور دھوکا دیکر پیرس پر قبضہ کر لیا جائے گا، لیکن اس کے بعد تین فوجیں پیرس پر حملہ کریں گی اور وہ شخص جس نے دھوکا دیا تھا معہ اپنے رفیقوں کے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اس کے بعد فرانس کو مختصر سا زمانہ امن و ترقی کا مل جائے گا۔ اس عہد کے متعلق اس نے ایک عجیب و غریب پیش گوئی کی ہے کہ ایک نیا بادشاہ ہنری پنجم جس کی ولادت ۱۹۳۲ء میں ہوگی، فرانس کے تخت پر بیٹھے گا جو اسپین پر بھی حکومت کرے گا۔ یہ بادشاہ ہنری چہارم کی اولاد میں سے ہوگا لیکن ناجائز اولاد!

اول اول پانچ سال تک اس کا پایہ تخت (Avinion) رہے گا، کیونکہ پیرس تباہ ہو چکا ہوگا، اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں اس کی سلطنت اٹلی تک وسیع ہو جائے گی اور تین قوموں پر اس کی حکومت ہوگی، یہاں تک کہ وہ جرمنی کی بغاوت کو بھی دبائے گا اور رہائش تک فرانس کے حدود وسیع ہو جائیں گے۔ اس نے اسی زمانہ روس و جاپان کی جنگ کی بھی پیش گوئی کی ہے۔

یہ پیش گوئیاں ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک کے زمانہ کے لئے ہیں اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد اس نے مستقبل بعید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۹۹ء میں ایک بڑا زبردست بادشاہ آسمان کی طرف سے اترے گا، اس کی زبان بہت عجیب و غریب ہوگی جو لاطینی یا یونانی شاخ کی زبانوں میں کسی زبان سے ملتی ہوگی۔ اس کے پاس بڑے جہلک اسلحہ ہوں گے اور ہر حق اس کے ساتھ ہوں گے۔ چونکہ ہرن شمال سائبیریا کی قوموں کا نشان ہے اس لئے اس پیش گوئی سے مراد غالباً یہی ہے کہ شمال سائبیریا کی قومیں سارے یورپ پر چھا جائیں گی۔ اس نے آگے چل کر کہا ہے کہ قومیں فرانس پر حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیں گی اور "ایک شعلہ ایسا بھڑکے گا کہ وہ خود بھی اسے نہ بجھا سکے گی اور فرانس کی راجدھانی جیلر بالکل خاک ہو جائے گی اور ایک آدمی بھی اس کا زندہ نہ بچے گا"

۱۹۳۲ء کے متعلق اس نے عجیب و غریب پیش گوئی کی ہے اور وہ یہ کہ یہ سال یورپ کی عام تباہی کا سال ہوگا، صحرائے کوئی پھر سمندر میں تبدیل ہو جائیں گے اور دنیا کا نقشہ بالکل بدل جائے گا۔

ان پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے انجام کو بھی دیکھ لیا تھا، چنانچہ یکم جولائی ۱۹۶۶ء کی شام کو جب اس کا نوکر آئندہ صبح کے لئے دعائے عافیت دیکر رخصت ہونے لگا تو نوٹس ڈاؤن اس نے کہا کہ "صبح تک میں کہاں رہوں گا" اور واقعی وہ ۲ جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح کو اپنے بستر پر موت کی ابدی نیند سو رہا تھا۔

ماسکو کی خونیں تاریخ

ایک خستہ حال، خاک بھر پھرا، ہانپتا کانپتا فرمانروائے ماسکو کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ ”دشمن دریائے وولگا کو عبور کر چکا ہے اور لوٹ مار کرتا، بستیوں میں آگ لگاتا اور آدمیوں کو ذبح کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب وہ عنقریب اس شہر میں پہنچنے والا ہے اور مغرب کی کوئی صورت ہمارے سامنے نہیں بلکہ کوئی دشمن تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہے۔“

جو کچھ اس تجربے کا وہ حرقہ حرقہ صحیح نکلا، کیونکہ دشمن اپنی خونیں یلغار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور ماسکو پہنچ کر تمام عمارتیں زمین کے برابر کر کے رکھ دیں۔ بادشاہ و امراء، گرجا میں پناہ گزیں ہو چکا تھے، لیکن فاتح نے یہاں بھی ان کو نہ چھوڑا اور حکم دیا کہ گرجا میں آگ لگا دی جائے۔

یہ واقعہ اب سے سات صدی پہلے (۱۲۳۷ء) کا ہے، جب چنگیز خاں کے ایک پوتے باقی نے ماسکو پر حملہ کیا تھا اور ماسکو کی تاریخ میں سب سے پہلا اسی حملہ کا ذکر ملتا ہے، اس حملے سے ایک صدی قبل ماسکو کی بنیاد ایک شہزادہ نے ڈالی تھی جو ہر ولد ثانی، شاہ انگلستان کا داماد تھا اور خدا معلوم کس ساعت میں یہ بنیاد پرستی تھی کہ ہمیشہ آگ و تلوار سے اس شہر کو برباد کیا گیا اور ہمیشہ یہاں کی خاک سے پھر دوسرا ماسکو پیدا ہو گیا۔

روس کا مشہور قومی شاعر ٹشکن لکھتا ہے کہ ”ماسکو کا لفظ روسیوں کے دل پر جو اثر کرتا ہے، اس کا اندازہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس لفظ میں بیشمار ایسی روایات چھپی ہوئی ہیں جو ایک ایک روسی کے دل میں منقوش ہیں۔“ اور اس میں شک نہیں کہ روسی اس شہر سے حدودِ محبت کرتے ہیں۔ یہ شہر ان کے لئے خاص مذہبی عظمت رکھتا ہے کیونکہ قدیم ایام میں جب روس کی قومی زندگی میں مذہب کا بہت اثر پایا جاتا تھا، ماسکو ہی ایک ایسا مقام تھا جو صحیح عیسویت کا مرکز تھا۔ ہر چند سنہ ۱۲۹۱ء اور سنہ ۱۵۴۷ء کے مشہور گرجا، رومن میں بسائے جاتے تھے، لیکن وہ دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکے تھے۔ رومن کی تباہی کے بعد جب ترکوں نے سلطنتِ باطلین کو بھی ختم کیا تو اس وقت صرف روس ہی ایک ایسا ملک رہ گیا تھا جسے صحیح معنی میں عیسوی حکومت کہہ سکتے تھے اور جس کے پایۂ تخت ماسکو کا گرجا تمام یورپ کے کلیساؤں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسرے ملک کے لوگ جب ماسکو جاتے ہیں تو وہ ماسکو کی تعمیر اور وہاں کی فضا کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کیونکہ اسے نہ مغرب شہر کہہ سکتے ہیں نہ مشرق۔ بلکہ وہ دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سنٹ باسل کی تعمیر کی وشنیاء عظمت، کرمین کے جدید کلیسا، مضافات میں لکڑی کے مکانات اور وہاں کی گلیاں سب ملکر مغرب و مشرق دونوں کا ملا جلا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہے۔

اول اول جب ماسکو تباہ کیا گیا تو وہاں کے باشندوں نے چند سال کے اندر اسے زیادہ وسیع پیمانے پر پھر از سر نو تعمیر کر لیا، لیکن نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ گزرا تھا کہ ۱۲۹۱ء میں پھر تاتاریوں نے حملہ کیا اور تمام گرجا اور عمارتیں جلا کر اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد جب تاتاری ماسکو کو ویران و برباد کر کے چلے گئے تو بقیہ السین آبادی نے جلتے ہوئے مکانوں کی آگ بجھائی، خاک کے ڈھیر صاف کئے اور گیارہ سال کی مسلسل محنت کے بعد پھر از سر نو اسے آباد کیا اور نصف صدی تک یہ شہر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ تاتاریوں سے زیادہ ظالم ایک اور دشمن نے، اس پر پھر حملہ کیا اور یہ دشمن طاعون تھا۔ اس نے آدمی سے زیادہ آبادی صاف کر دی۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے بعد اہل ماسکو نے پھر اپنے شہر کو منواریا، لیکن ۱۳۸۰ء میں تاتاریوں نے پھر اس کا محاصرہ کیا۔ اس مرتبہ اہل ماسکو نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو وہ دشمن کو اندر نہ آنے دیں گے، چنانچہ حملہ آور حیب بڑھتے تھے تو برجوں سے کھوتا ہوا پانی اور لکڑیوں کے بڑے بڑے گندے ان پر پھینکے جاتے تھے اور برابر تین دن تک سخت مقابلہ جاری رہا۔ تاتاریوں کو اس محاصرہ میں اتنا نقصان ہوا کہ انھوں نے مکر و فریب سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور شہر والوں کو پیام بھیجا کہ اہل ماسکو سے ان کو کوئی عداوت نہیں ہے بلکہ لڑائی صرف فرمانروا اور اس کے ساتھیوں سے ہے اس لئے اگر باشندگان ماسکو

شہر سیاہ سے باہر نکل کر، ناچاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیں، ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے دشمن کی اس بات کا یقین کر لیا اور پادری کی قیادت میں تحائف وغیرہ لیکر دشمن کے پاس چلے، لیکن تاتاریوں نے بدعہدی کر کے ان پر بھی حملہ کر دیا اور پھر قلعہ کرملن میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن میں ۲۲ ہزار آدمی انھوں نے قتل کئے، اس کے بعد شہر کو ٹوٹا شروع کیا اور لوٹ مار کر کے واپس چلے گئے۔

اس حملے میں صرف چند ہی مکان باقی رہ گئے جو پتھر کے بنے ہوئے تھے ورنہ سب کے سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے، لیکن اہل ماسکو نے پھر ہمت سے کام لیا اور ۱۹۳۹ء تک ایک اور نیا ماسکو جو بہت زیادہ وسیع و شاندار تھا طیار کر لیا۔

یہ وہ تباہیاں تھیں جو بیرونی حملہ آوروں کی طرف سے ماسکو پر نازل ہوئیں، لیکن خود وہاں کے فرمانرواؤں نے جو بربادیاں پھیلائی ہیں وہ بھی کم نہ تھیں۔ اس سلسلہ میں یہاں کے فرمانروا واسیلی سوم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

شادی کے ۲۰ سال بعد تک جب کوئی اولاد اس کی نہ ہوئی، تو اس نے اپنی بیوی کو بچور کیا کہ وہ گرجا میں جا کر گوشہ نشین ہو جائے تاکہ اسے دوسری شادی کرنے کا موقع مل جائے۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ پادری کو اطلاع دی کر کیا اس کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پادری نے فوراً جواب دیا کہ اگر بادشاہ نے دوسری شادی کی تو اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ تاتاریوں سے زیادہ ظالم ثابت ہوگی اور رعایا کا انساخون ہے کہ تاریخ اس کی نیکر و پیش کر سکے گی۔ لیکن بادشاہ نے کوئی پروا نہ کی اور دوسری شادی کر لی جس سے ایوان (Ivan) پیدا ہوا، جو روس کی تاریخ میں مشہور ظالم بادشاہ گزرا ہے۔

اس کے مظالم کی داستان بہت عجیب و غریب ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسے اپنی رعایا کی جان پر بھی پورا اختیار حاصل ہے وہ راستہ چلتے ہوئے اس شخص کو قتل کر دیتا جس کی صورت اسے اچھی نہ معلوم ہوتی اور اس کے سر کو ٹھکراتا ہوا گزر جاتا۔ اس کا دماغ چلا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ولوگڈا والوں سے کہل بھیجا کہ ایک گھڑ بھر پیسو بھجیں، لیکن چونکہ پیسوں کی اتنی مقدار فراہم نہ ہو سکی، اس لئے اس نے اہل ولوگڈا پر سات ہزار روبل جرمانہ عاید کیا۔ ایک بار اتفاق سے فرانسیسی سفیر اس کے سامنے ٹوپی اتارنا بھول گیا، اس نے حکم دیا کہ ٹوپی پر ایک کیل رکھ کر اس کے سر میں ٹھونک دی جائے اور جلسہ عام میں تقریبی خونریزیاں تو اس نے اتنی کیں، کہ دردناک سے باہر ہیں۔

سب سے آخر میں ۱۵۱۲ء کا وہ حملہ جب پولین نے یہاں داخل ہو کر تباہیاں پھیلائیں سبھی کو معلوم ہے، لیکن اس قدر عجیب بات ہے کہ باوجود قحمت کی اس زبونی کے ماسکو اتنا سخت جان واقع ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ مر مر کر زندہ ہوا اور تباہ ہوا ہو کر اس نے ترقیاں کیں۔ اب ہٹلر اس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخ پھر اپنی دیرینہ روایات کو نہ دہرائے گی اور ماسکو اس خطرہ کا مقابلہ کرنے میں ناکامیاب رہے گا۔

”شہوانیات“ (مصنفہ نیاز فتحپوری) کا دوسرا ڈیشن

جو نظر ثانی کے بعد مقبول عام سائز پر نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شائع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ۸ روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

مشہور شاعر گمنام غزل گو

دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جو مختلف حیثیتوں سے قابل ذکر تھے لیکن دنیائے ان کی صرف ایک ہی حیثیت کو سامنے رکھا۔ اردو کے مشہور شاعری نگار حیرت حسن بھی ان میں سے تھے۔ کون ہے جو شاعری نگار کی حیثیت سے ان سے واقف نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انھوں نے اس صنف میں جو کمال پیدا کیا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو ان سے حیثیت غزل گو بھی واقف ہوں بعض حضرات کو تو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ حسن کی غزلیات کا ایک دیوان بھی ہے مگر ان کا تعجب اور حیرت بجا ہے۔ ان کی شاعری نگاری کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا کہ غزل گوئی نام نہان ہو گئی۔ ایک زمانہ تھا جب میں بھی میرے کچھ اسی طرح متاثر تھا ان کے کلام کے آگے دوسروں کا کلام روکوا پھینکا اور بے اثر معلوم ہوتا تھا۔ غزل گو کی حیثیت سے میرے دل میں حسرت کی کوئی قدر نہ تھی لیکن جب ان کا دیوان نظر سے گزرا اور اس کا بغور مطالعہ کیا تو روز بروز ان کی عظمت کا سکھ دل پر چھنے لگا۔ ایک بار نہیں متعدد بار ان کا کلام پڑھا اور بہت لطف اٹھایا۔ کسی شاعر کے کلام کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ اس کے ماحول کا خاکہ ہمارے ذہن میں موجود ہو اور ایک حد تک ان نظریات درجہ جات کو بھی ہم جان لیں جو اس کے کلام پر اثر انداز ہوئے اس لئے مختصر آبیہ مدام کر لیجئے:

ماحول: میر حسن نے باہویں ممدی جبری میں اہلکھ کھولی۔ وہ زمانہ تھا جب خلیہ سلطنت کا نظام بگڑ چکا تھا، سلطنت کی جڑیں کو دور ہوتی جا رہی تھیں۔ بادشاہ صرف نام کا شہنشاہ رہ گیا تھا، تمام امر اور سار خود مختار نواب بن بیٹھے تھے، خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا، یہاں تک کہ نادر شاہ حملہ آور ہوا اور دہلی کو تاراج کر کے اپنے وطن سدھارا۔ اس کے بعد چاروں طرف مرہٹوں کی فوٹ مار شروع ہوئی اور احمد شاہ درانی نمودار ہوا اور دہلی کے گلی کوچوں کو ایک بار پھر در شاہی قتل و خون کی تصویر دیکھنا پڑی۔ شہنشاہ نے دارالخلافہ چھوڑ کر الہ آباد میں قیام کیا اور مرہٹوں کی مدد سے حکومت شروع کی۔ اسی زمانہ اور اسی عہد میں دہلی کے ایک گوشہ میں میر غلام حسن نامی ایک شخص پیدا ہوا جو بعد کو شاعر کی دنیا میں حسن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نظام سلطنت کی جبری کے واقعات کانوں سے نہیں سنے بلکہ ان کی بستی چھری تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ دہلی کو ہر طرف سے بریشانی مسیبتوں نے گھیر لیا تو دوسرے اہل کمال کے ساتھ حسن نے بھی فیض آباد کا رخ کیا اور نواب سالار جنگ اور ان کے بیٹے کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ حسن شاعر تھے اور ایک حساس دل کے مالک، دہلی کی تباہی، بربادی اور زبوں حالی کے نقشے ان کی نظر سے گزر چکے تھے، ان تمام حالات واقعات اور مشاہدات کا ان کے دل پر ایک گہرا اثر پڑا اور دوسرے شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی مسرت و اندوہ کا رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ ان سب اثرات کی وجہ سے ان کے کلام میں یاس و حسرت، دُنیائے سبزی، سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پیدا ہو گئیں۔

معاصرین: ان کے معاصرین میں میر اسودا، درد، منظر جان جاں، ضیاء اور سوز قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ان حضرات کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور ایک بڑی حد تک ان کے اثرات سے متاثر بھی ہوئے تھے جس کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے۔

شاگردی: شاعری میں ان کو میر ضیاء سے ممتاز حاصل تھا، استاد کے رنگ کو بخوبی نبھانے کے لیے وہ سب سے میر درد اور اکثر اسودا کا تتبع کرنے لگے چنانچہ اس کا تذکرہ اپنے کلام کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ ان اساتذہ کی پیروی سے ان کے یہاں ایک جبرہ انگریز متون اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔

شاعری زبان اور خیال کے موزوں امتزاج کا نام ہے۔ لہذا کسی شاعر کے کلام سے بحث کرتے وقت یہ دونوں چیزیں پیش نظر ہونا چاہئے۔ ذیل میں حسن کی غزلیات کو زبان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میر حسن کی زبان نہایت سادہ، سلیس، لطیف اور فصیح ہے البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ حسن کے کلام پر نظر ڈالئے تو اس کی سلاست، روانی اور لطافت آپ کا دل موہ لے گی۔ میں کیا۔ میں کہا۔ دیکھوں ہوں۔ دیکھتے ہے۔ پرے اور تلک وغیرہ الفاظ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ متروک ہونے کے باوجود بھی جھلکے ہیں انہی الفاظ کا طفیل ہے کہ ان کے یہاں میر تقی میر کی سی دلآویزی، لطافت، نرمی اور گلاؤں پیدا ہو گئی ہے، وہ مٹی کی بلکہ مٹی، ہمیشہ کی بگرت، دیوانے کی بلکہ دیوانے، کبھی کی جگہ کبھو کب تک کی جگہ کب تک، بد و مانگ کی جگہ بے مانگ استعمال کرتے ہیں مگر کلام میں جلی نہیں آنے پاتی بلکہ عجیب کیف پیدا ہوتا ہے۔

مت دست ہوس کو تو بھکا لینے کو اس کے
مانی سے سب آلود ہے اسباب جہاں کا

بت خانے میں چل بیٹھ یا کعبہ میں حسن اب
وہ ملک دل کہ اپنا آباد بھتا بکھو کا،
یہ سب اپنے خیال خام تھے تم تھے پرے سب سے
دور میں اپنے الہی رہے گا کب تیس یوں،
طبع نازک کے ہاتھ سے اپنے
یوں کہ تلک دو آنے تو در بدر پھرے گا،
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا
جو کچھ سمجھے تھے ہم تم کو یہ سب اپنا تو ہم بھتا
بادہ شیشے سے جدا شیشے سے پیاز جدا
عمر بھر میں تو بے دماغ رہا

وہ زبان پر کامل قدرت رکھتے ہیں ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن فقروں کے دروہست سے ان میں ایسا لوچ پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے ثقل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مشکل یہ مشکل قافیہ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ ہر مڑی کے بجائے شعر میں اچھا خاصا لطف پیدا ہو جاتا ہے:

وہ ملک دل کہ اپنا آباد بھتا بکھو کا
لایا غرور پر یہ عجز و نیاز تجھ کو،
کس مست ناز نے کل میخانہ پر نگہ کی
خورشید ہی پر اپنے منکر ہوا فلک تو
یاں داغ دل بھی اپنا اک دن جھکے اٹھا

اسی طرح شکل رد نہیں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن صفائی و سادگی میں فرق نہیں آتا۔

افتادگی جو چاہے تو رکھ پوشش نقش پا
کم حوصلہ ہیں ہم کو کہاں دید کی نظر
ایک دم ناقد کو ٹھہرنا نہیں مجنوں کے پاس
کوہ و صحرا سے تو گھبرا کے لے آیا تھا مجھے

سو دلی طرح انھوں نے بھی اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کے استعمال سے زبان کو گنگا جمنی بنایا ہے۔ مثال کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

ریت گرے یہی اُلٹی تو بھلا آج سے ہی
جاتا تھا اس کی کھوج میں میں بے خبر چلا
عشق کی گم گشتی اور سنجو دی پال مضمون ہے مگر حسن نے بالکل نئے ڈھنگ سے بانٹھا ہے:-

دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا
ایک کو ایک کا سراغ رہا،

جوت ادا کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

نکل اے جاں اب دل سے کہ صاف دیا آتا ہو
کس منہ سے میرے یار کے ہوتا ہے روبرو
ترا تو دل ہی اٹھے کو نہیں کیا یہ بھی گھر جاتا
چہرے کے داغ اپنے تو مہتاب دیکھنا

ماہرین معنی و بیان نے صنائع و بدائع کو کلام کا زیور قرار دیا ہے۔ جیسے ایک خوبصورت عورت شگھار اور گہنوں سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے اسی طرح تشبیہ، استعارہ اور دیگر صنائع لفظی سے کلام کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ان تمام محاسن کے باوجود اگر ان کے استعمال میں غلو کیا جاتا ہے تو کلام میں حسن کے بجائے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں اور شعر لفظی بازیگر کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اردو کے تمام شاعروں نے کم و بیش اس کو استعمال کیا ہے اور بعضوں کی لے تو یہاں تک بڑھی ہے کہ ان کے اشعار مسمیٰ اور چیتاں ہو کر رہ گئے ہیں۔ حسن نے بھی اپنے کلام کو صنائع سے زینت بخشی ہے مگر سلا متی طبع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً:

ٹکے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گرا سکا بڑی
یجا سے جیسے غنچہ پڑ مردہ کو صبا!
دھوپ جیسے شام کی ہو اور سحر کی چاندنی
یوں آہ لے کے سخت جگر تہہ بہ گئی
روئے میح نے نک اس میں ملا دیا
کیفیت اب رہی نہیں جام شراب میں

اٹھا بالوں کو چہرے سے دکھا دے چاند سا کھڑا
سر شام آج آتا ہے نظر تنہا مجھے تارا
اپنے عقدے کسی طرح نہ کھلے
کس دل آزار کی جبین ہیں ہم
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہو میرا
جیسے کوئی بھوسے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کلام حسن کا لفظی تجزیہ ہے اب ذرا معنوی پہلو پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ان کے یہاں کیا کیا جواہر پارے بھرتے ہوئے ہیں۔

میر کا رنگ : کہاجاتا ہے میر صاحب کا کلام داخلی رنگ لئے ہوئے، ان کا کلام آہ ہے، اس میں انتہائی درد و اثر اور سوز و گداز نہیں ہے۔ ان کی زبان نرم، میٹھی، اور سادہ ہوتی ہے لیکن انہی نرم، میٹھے اور سادہ الفاظ میں نشتروں کی سی آبداری ہوتی ہے جس سے سامع کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے مثلاً:

سربانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تلک روتے روتے سو گیا ہے
ہمارے آگے ترا جب کس نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے مقام مقام لیا
اُن نے بچپان کر ہمیں مارا
منہ نہ کرنا اور مہر تغافل بھتا
دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

میر حسن نے میر کے تتبع میں جو اشعار کہے ہیں ان میں بھی شیرینی، سادگی، گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ نشتریت پائی باقی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان اشعار کو میر کے دیوان میں شامل کر دیا جائے تو بمشکل لوگ ان کو میر کے کلام سے علیحدہ کر سکیں گے۔ ملاحظہ ہو:

تیرا حسن - رونما یونہی اگر رہے گا
ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا
جب سے جدا ہوا وہ شوخ تب سے مجھ کو
نت آہ آہ کرنا اور زار زار رونا
تمہیں بھی یاد آتے ہیں وہ دن کہ کوئی دن
ہمارے حال پر کیا کیا ترنم اور تفضل تھا
رورو کے کیا ابتر سب کام میرے دل کا
لکھو یا مری آنکھوں نے آرام میرے دل کا
اپنی طرف سے ہم نے تم سے بہت شہیا یا
پر آہ کیجئے کیا تم نے ہمیں نہ چپا ہا
وصل ہوتا ہے جن کو دنیا میں
یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

کہتے ہیں میر کے بعض اشعار ایسے ہیں گویا وہ چپکے چپکے اپنے دل سے باتیں کر رہے ہیں، حسن کے یہاں بھی اس قسم کے شعروں کی کمی نہیں، مثال کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

کروں شکوہ تو بے دسواں میں اس سے نہ آنے کا
نہ ہو دھڑکا مرے دل میں گر اس کے روٹھ جانے کا
وساطت سے کسی کی چھپ کے بھی چاہا نہ کچھ در نہ
ایا تھا ڈھب تو یاروں نے بہت اس سے لانے کا
حسن تو ہر کسی سے حال دل کہتا پھرے ہے کیوں
عبث بدنام ہوگا اور نہیں کچھ اس میں پانے کا
لامت بھی کریں گے اور اُلٹی تھکھو نہیں کہ
کوئی احوال پر تیرے نہیں افسوس کھانے کا

سودا کا رنگ : کبھی کبھی حسن کے اشعار میں سودا کا انداز دکھائی دیتا ہے۔ مشہور ہے کہ سودا کی شاعری انبساطی ہے، درد و عالم سے ان کو کوئی واسطہ نہیں، طراقت و خوش طبعی ان کی جان ہے، ہشاش بشاش آدمی تھے خود بھی ہنستے اور دوسروں کو اپنے رنگین کلام سے ہنساتے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ طراقت، ہنسی اور شوخی کے پردے میں اپنے غموں کو چھپا کر دل کی تسکین کرتے تھے۔ ان کے خیالات میں بلندی اور الفاظ میں شان ضرور ہوتی ہے لیکن وہ درد کی کسک سے بھی غالی نہیں۔ حسن بھی جب کبھی روتے روتے تھک جاتے تو دل بہلانے کی خاطر سودا کی طرح تائیں اڑانے لگتے اور وقتی طور پر ان کے کلام میں بھی وہی مستی وہی جوش و ترنگ اور شوخی نمایاں ہو جاتی ہے:

حاصل اس باغ کے آنے کا تو ہے دید، بھلا
گلشن ہستی کا ہم کیونکہ تماشائے کریں
ترے دل سے تو مجھے بات یہ لگتی ہے - ہے بعید
تو نے کس دل سے حسن کو مری جاں چھوڑ دیا
دم رکتا ہوا آتا ہے اب تک مرے غم سے
عقدے ترے ہیں بسکہ مرے تار نفس میں

سوز کا رنگ : جب کبھی سوز کا چربہ اُتارتے ہیں تو وہی معاملہ بندی، نزاکت اور چٹکلے بازی کرنے لگتے ہیں مثلاً:

کیا مسکرائے تھے اب پھر کب آئے گا
دل بے قرار ہوتا ہے کچھ تو قرار کر
بزم شراب ہے اور تنہا ہے یکس جہر
پر دے ہی میں تو اپنا منہ آفتاب رکھنا
بھولے سے میں کہا تھا اس سے کہ دل ہے میرا
کہنے لگا بغل میں اب اس گود اب رکھنا
مجھ سے ہوا نشہ میں ہم آغوش آشنا
یارب اسی طرح رہے بے ہوش آشنا
دیکھ دروازے سے مجھ کو وہ پری روہٹ گئی
دیکھتے ہی اس کے مری جان بس چٹ پٹ گئی
پرسے ہی پردے میں دل کو خاک کر ڈالا مرے
اس اداسے وہ پری منہ پر لے گھونگھٹ گئی

درد کا رنگ : میر تقی میر کے بعد حسن اگر کسی شاعر نے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں تو وہ میر درد ہیں۔ میر درد ایک صوفی منش بزرگ تھے ان پر جو گزرتی وہی نظم کے پردے میں ظاہر کر دیتے مگر حسن تو صوفی تھے اور نہ درویشوں سے ان کو کوئی خاص لگاؤ تھا۔ ان کی غزلیات میں تصوف کے جو مسائل حل کئے گئے ہیں وہ محض رسم اور درد کی تقلید میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ درد تک نہ پہنچ سکے، لیکن ناکام نہ رہے۔ تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ موجود حقیقی سے تمام کائنات پیدا ہے، حسن نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :

تو ہے تو مری جان و دل و جسم ہے درد
کیسا دل اور کیسا ہے جی اور میں کہاں کا

صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ہم میں موجود ہے، وہ ہم سے بیگانہ نہیں لہذا اگر ہم اس کو پہچان نہ سکیں تو ہمارے فہم کا تصور ہے حق بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں :

بیگانہ ہے یہاں کون اور اپنا یہاں کون
ہے سب یہ عقیدہ مرے ہی وہم و گماں کا

مرضی ہو جہاں اس کی وہی جا ہمیں بہتر
مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغ جنان کا

جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ
آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم تھا خزاں کا

کرتا میں حسن قدس کے عالم ہی میں پرواز
ہستی کا اگر اپنی گرفتار نہ ہوتا

کوئی دیتا نہیں اس بت کو دل کچھ اپنی خفا ہے
جو یوں مرضی خدا کی ہو تو پھر بندے کا کیا کہنا

نفسیاتی عنصر : حسن فطرت انسانی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ یہاں ان کی شاعری سحر البیان سے بخوبی واضح ہے۔ جس طرح شنوی میں نفسیاتی عنصر جگہ جگہ نمایاں ہے اسی طرح غزلیات میں بھی اس کی کمی نہیں۔ کہتے تو ہیں معمولی سی بات مگر نہایت نئی تلی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے :

نور گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی تفس میں بھی مرا لگ جاسے گا

روزانہ زندگی میں ہر شخص کو انگوں واقعات اور عجائب سے دوچار ہوتا ہے لیکن جب وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کا ذہن بات پر متوجہ ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے :-

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہونچے
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اسی رنگ کے اور چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

جس جا پتم نے باتیں کی تھیں کھڑے ہوا کون
جب دیکھنا وہ جا گرے اختیار روزنا

درد کی بات تھوڑی سی بھی لگتی ہے بہت
ہو رہا ہے بسکرت سے دل اپنا گداز

اسی طرح یہ شعر بھی ہے :-

انفرادیت : بظاہر حسن کے یہاں کوئی انفرادی رنگ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان کا کلام اساتذہ کی خصوصیات کا مجموعہ ہے لیکن ان کے کلام کے بغور مطالعہ سے ان کے ایک مخصوص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ ان کی اکثر غزلیں مسلسل اور بیشتر میں قطع بند اشعار داخل ہیں۔ میرے خیال میں تسلسل بیان ان کی انفرادیت ہے اور اسکی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ یہ پہلا شنوی ننگار ہیں اور بعد کو غزل گو۔ شنوی کی سب سے اہم خصوصیت ربط یا تسلسل کلام ہے جس میں حسن کو بہارت نامہ حاصل تھی لہذا جب کبھی یہ غزل کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو تسلسل بیان غیر شعوری طور پر قطع بند اشعار کی شکل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر چند غزل کی شان یہ ہے کہ اس کا ہر منہمون ایک ہی شعر میں پورا ہو جائے لیکن حسن قطعات اس حسن و خوبی سے غزلوں میں سمودیتے ہیں کہ شعر کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ایک مسلسل غزل اور چند قطع بند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

جو منہ میں آیا اس کے سو ختم نہ کہہ گیا
کچھ مجھ کو بن نہ آئی میں درد کے رہ گیا

آگے زبان درازی تو اتنی نہ تھی کبھی
کیا جانے کس کے کہنے پہ وہ رشک مر گیا

یہ سخت سست باتیں سنائیں کہ کیا کہوں
قابل جو کچھ نہ کہنے کے تھا اور سننے کے
دل میں تو آئی تھی کہ حسن تو بھی بول اٹھ
غیروں میں دیکھ تجھ کو بیٹھے ہوئے کہیں کیا
پر منصفی سے اتنا فرمائیے کہ بارے
کس تلخ کامیوں سے راتیں حسن : نکاشیں
یہ کیا جانے حسن تھا یا کون تھا اس کے آگے
تسہرے جواب اس کو ملتا تھا ادھر سے
میں اک روز پوچھا جو اس شوخ سے
تو نہیں کر لگا کہنے کیا خوب کیوں
یہ سنکر جو میں چپ رہا تو کہا

دیر یا غضب کا تھا کہ مرے سر سے بہہ گیا
سو کہہ گیا وہ شوخ مجھے اور میں بہ گیا
پر دل میں سوچ سوچ کچھ اپنے رہ گیا
جو کچھ کہ اپنے دل پہ گزرا سو حال گزرا
خدمت میں آپ کی بھی کچھ انفعال گزرا
پر تو اس تک اک دن شیریں مقال گزرا
احوال کوئی اپنا درد رو کے بک رہا تھا
بے چارہ اپنے سر نو ناقہ ٹپک رہا تھا
کہ کیوں کچھ تجھے بھی مری چاہ ہے
تو میرا کہاں کا ہوا خواہ ہے
ابے دل کا مالک تو اللہ ہے

سوز و گداز : انہوں نے چھوٹی بھری بے شمار غزلیں کہی ہیں اور ان کی عجب شان ہے، نہ تشبیہ ہے نہ استعارہ لیکن درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، بیشتر اشعار سہل ممتنع ہیں۔
چھوٹے چھوٹے الفاظ کے سر پہ نعموں سے اثر دیکھتے محسوس ہو کر سامنے آجاتا ہے:

دل کو لیکے صنم جدا ہو گیا
خار سے پھوٹے پھپھوٹے پاؤں کے
دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا
دل خدا جانے کس کے پاس رہا
یاس کوئی مگر ہوئی تازہ !
تو خفا مجھ سے ہو تو ہو لیکن
ہنسنا اور بولنا تو ایک طرف

اے مرے اللہ کیا ہو گیا
درد ہی آخر مرا درماں ہوا ،
ایک کو ایک کا سراغ رہا
اتن دنوں جی بہت ادا اس رہا
آج پھر دل مٹھال ہے اپنا
میں تو تجھ سے خفا نہیں ہوتا
سامنے اس کے میں تو رو نہ سکا

فلسفہ : اگر ان کے دیوان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بعض بہت اہم اور کام کی باتیں ملتی ہیں، تحقیق اور کاوش کے بعد ان کے ایک فلسفہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے خیال میں دنیا کا مسئلہ لائیل ہے، دنیا کے رازوں کو سمجھنا ان کے خیال میں انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ انسان لاکھ لاکھ کوشش کرے اور سراسر مگر دنیا، غیب اور اس کے سر بہت رازوں کا انکشاف اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ گتھیاں اس کے سمجھائے نہیں سلجھ سکتیں :-

سر بہت رہا یونہی : راز حرم و دیر
ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی
شب فراق میں رو رو کے مر گئے آخر !
اپنے عقدے کسی طرح نہ کھلے !
یہ جو کچھ قیل و قال ہے اپنا
نہ دہری کو سمجھوں ہوں نہ کہہ یہ ترا
کوئی دیتا نہیں تحقیق خبر اسکی حسن
ناخن نہ پہونچا آبلہ دل تلک حسن

معلوم ہوا بھیدنیاں کا : وہاں کا ،
تمام عمر پھرے پر ہم یہ سوز ہوئی
رات جیسی تھی ویسی رہی سوز ہوئی
کس دل آزار کی جبین ہیں ہم
وہم اور خیال ہے اپنا ،
پہرنا ہے اشتیاق لئے در بدر مجھے
پوچھتا پھرنا ہوں سودا کی ساجس تس سے
ہم مر گئے یہ ہم سے نہ آخر گرہ گئی

سرمایہ داری سے نفرت: حسن کو کبھی چین نہ نصیب ہوا ہمیشہ پریشان حال رہے اور عسرت و تنگی میں بسر کی، انھوں نے کہیں لکھا بھی ہے "بہر حال گزراں می نمایم" اس فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ انھیں کبھی فراخ دستی حاصل نہ ہوئی اور ہمیشہ روپیہ پیسہ کی طرٹ سے پریشان رہے۔ اس عسرت اور تنگ دستی کی وجہ سے وہ سرمایہ دارانہ نظام سے ناخر ہو گئے اور اپنے اشعار میں اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ امیروں کو غریبوں کے حال کی کیا خبر وہ اپنی دولت کے نشہ میں چور ہیں، چلتے ہیں تو سیکڑوں ہزاروں زندگیاں ٹھکراتے ہوئے، ہنستے ہیں مگر لاکھوں کوڑا کوڑا وہ کیا جانے کہ غریب پیارے کیونکر زندہ رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی ساری عمر مصیبتوں، پریشانیوں اور غربت میں بسر کر دیں وہ کیا یاد کریں گے کہ کبھی دنیا میں بھی رہے تھے گویا کہ دنیا میں رہنا عیش و آرام کے مترادف ہے۔ ان کے دل پر ایک زبردست جذبہ رشک طاری ہوتا ہے۔ آخر میں وہ یہ کہہ کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں کہ اگر امیروں کے پاس عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں تو ہم غریبوں کے لئے بھی "غم و درد" کا سامان کافی ہے:-

گلوں کو کیا خبر حال زارِ عندلیبوں کی
حقیقت مفلسوں کی آہ زردالوں بگمت پوچھو
وصل کا عیش کہاں پر غم بھراں تو ہے
لبخنداں تو نہیں دیدہ گریاں تو ہے
گو نہ ہو عیش کا سامان میر تو نہ ہو
واسطے دل کے غم و درد کا سامان تو ہے
کیا کریں گے یاد اس دنیا میں آکر وہ غریب
حرف غم میں اپنی جو اوقات ساری کر گئے

حقائق زندگی: ہمیں ان کے کلام میں زندگی کی بے لاگ، ٹھوس اور زندہ حقیقتیں بھی ملتی ہیں انھوں نے لوگوں کی عیش و آرام کی زندگی بھی دیکھی اور ان کا مصیبت کا زمانہ بھی۔ جب ان کے پاس پیسہ نہ رہا تو عیش کے دمانے کے سبب یار و احباب رخصت ہو گئے۔ ان مشاہدات کا رد عمل ہوا اور وہ بے تحاشہ چلا اٹھے:-

جب تلک زر ہے تو سب کوئی ہے پھر کوئی نہیں
سچ ہے مکھی بھی رہی ہے شکر و شیر تلک
زور سے کام نکلتا نہیں بے زر کے آگے
زر بھی حربہ ہے ترا ایک بشر کے آگے
زر اگر برسرِ فولاد نہی نرم شود
زور کا زور دھرا رہتا ہے زر کے آگے
اس زمانے میں اسے حسن مت پوچھ
ہے محبت کہاں کہ ہر اخلاص

اخلاقیات: حسن اپنے اشعار کے ذریعہ ہم کو اخلاقیات کا درس دیتے ہیں، استقلال کو انسان کی سب سے اہم اور ضروری خصوصیت قرار دیتے ہیں اور شمع کی طرح ثابت قدم رہنے کی تلقین فرماتے ہیں:-

جہاں ثابت قدم رکھنا دیاں سر سے گزر جانا
مزا ہے استقامت میں مثالِ شمع مرجانا

وہ نصیحت کرتے ہیں کہ جس شخص نے تمہارے ساتھ کبھی کئی نیکی یا احسان کیا ہو اس کے غلام رہو اگر تمہاری رگوں میں شرافت کا خون خوش زن ہے تو اپنے نخلص کی بات کا کبھی بُرا مت مانو:-

اپنے نخلص کی بات کا ہرگز
مت بُرا مان ہے اگر اخلاص

خاتمہ: سطور بالا میں حسن کی غزل گوئی پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی شاعری نگاری نے اس درجہ شہرت حاصل کی کہ غزل گوئی پر پردہ پڑ گیا۔ جس طرح سورج کے طلوع ہونے پر چاند اور چھوٹے چھوٹے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اسی طرح شاعری سحر البیان کی شہرت کے آفتاب نے ان کی غزل گوئی کو ماند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھے غزل گو بھی تھے اس حیثیت سے بھی ان کو شعرا میں ایک ممتاز جگہ مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں وہ سوز و غیرہ سے سبقت لے گئے تھے اور ان کو تیر اور درد کے قریب ہی کہیں جگہ ملنی چاہئے ان کے یہاں تیر۔ درد اور سودا کی خصوصیات کے علاوہ اور دلچسپ خوبیاں بھی موجود ہیں ان کے اشعار سوز و گداز اور درد و اثر کے اچھے خاصے نمونے ہیں زبان کی سادگی شریانی اور گھلاوٹ بھی قابلِ داد ہے۔ ذیل میں انہی خصوصیات کو مد نظر رکھ کر ایک انتخاب درج کر کے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے:

جان و دل ہیں اُداس سے میرے
اٹھ گیا کون پاس سے میرے
شاید اٹھنے کا تم نے قصد کیا
اڑ چلے کچھ حواس سے میرے
یار کا دھیان ہم نہ چھوڑیں گے
اپنی آہ ہم نہ چھوڑیں گے
کب میں گلشن میں باغِ باغ رہا
میں تو جوں لالہ داغ رہا،
جو کہ ہستی کو نیستی سمجھا
اس کو سب طرف سے فراغ رہا،

دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا
 نہ میں شمع ساں سر بسو جل گیا
 زندگی نے وفا نہ کی در نہ
 روتے ہی روتے راہ میں آخر
 حجاب عشق گر حائل نہ ہوتا
 نہ کرتا عشق سے گر علم تحصیل
 ہرگز نہ ہوش آیا اس کو کبھی عزتوں
 دروازہ گر کھلا ہے اجابت کا چرسن
 پاس ہی پاس گرد ہے دل کے
 دل کو کھو یا سہ کل جہاں جا کر
 کون گاڑا ہے نیم بسل یاں
 عشق کا اب مرتبہ پہنچا مقابل حسن کے
 گل ہے زخمی بہار کے ہاتھوں
 ہو رہا ہے خراب خانہ دل
 دل غم سے تیرے لگا گئے ہم
 بھولے سے تو نے پیار کی اک دلی کہی جوابت

ایک کو ایک کا سراغ رہا
 سراپا محبت کا گھر جل گیا،
 میں تماشا وفا کا دکھلاتا
 کام اپنا تمام کر اٹھا
 تو ملتا یار کا مشکل نہ ہوتا
 تو کچھ تحصیل کا حاصل نہ ہوتا
 بے ہوش ہوئے نکلا جو اس کی بخت سے
 ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں
 اور اب کوئی آس پاس نہیں
 جی میں ہے آج جی بھی کھو آئیں،
 زلزلہ جو اُسٹھے ہے عالم میں
 بن گئے بہت ہم آخر اس صنم کی یاد میں
 دل ہے صد چاک یار کے ہاتھوں
 دیدہ اشکبار کے ہاتھوں
 کس آگ سے گھر جلا گئے ہم
 رہا ہوں دل ہی دل میں اسے یاد کر رہا ہوں

محمد ریاض الحق

دی مغل لائن لمیٹیڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفے سے ممبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سوئیز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور بار برداری کے جہازات - ممبئی اور کراچی سے عدن - پورٹ سوڈان - جدہ اور سوئیز تک

مسافر اور مال و اسباب لے جاتے ہیں، نیز ممبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور مارشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسز اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے :- ٹرنر مارین - اینڈ کمپنی لمیٹیڈ ۱۶ - بینک اسٹریٹ - ممبئی

پورب اور کھم

دو ہواؤں کا تصادم

نام ہے پرل بک کی نہایت مشہور تصنیف کا جو اس وقت دنیا کے بہترین انتقادی ناولوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہر چند مصنف نے اس میں صحت چھین کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ وہ مغرب کا اثر کس طرح آہستہ آہستہ قبول کر رہا ہے، لیکن دراصل یہ وہ حالات ہیں جو نہ صرف چین بلکہ تمام مشرقی ممالک میں نظر آتے ہیں۔ اس آئینہ میں آپ کو ہندوستانی خواتین کے خدو خال بھی نظر آئیں گے۔ اور ادبیت تو خیر مسلم ہے۔ نیاز

یہ باتیں بہن میں تم کو بتلاتی ہوں۔ یہ تو ایسی باتیں ہیں جو میں اپنوں سے بھی نہیں کہہ سکتی، کیونکہ وہ اُن ملکوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے جہاں میرے شوہر نے اپنی زندگی کے بارہ سال گزارے ہیں اور پھر باتیں کسی پردہ سی عورت سے بھی نہیں کی جاسکتیں، جو ہماری قوم سے اور ہمارے اُس طرز معاشرت سے نا آشنا ہیں جس میں ہم سب پرانی حکومت کے زمانے سے زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن تم؟ تم تو برسوں سے ہمارے بیچ میں رہتی چلی آ رہی ہو۔ اگرچہ تمہارا تعلق بھی انھیں غیر ملکوں سے ہے جہاں میرا شوہر مغربی علوم کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، لیکن تم میری باتیں سمجھ سکتی ہو۔ میں سچ کہتی ہوں، میں نے تم کو اپنی منہ بولی بہن بنایا ہے اور میں تم کو سب کچھ بتلا دوں گی۔

میرے باعزت اجداد پانچ سو برسوں سے ”سلطنت وسطیٰ“ کے اس قدیم شہر میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اُن برگزیدہ ہستیوں میں کوئی بھی ”جدید“ نہ تھا اور نہ کسی نے کبھی اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا خیال کیا۔ اُن سب نے خاموشی کے ساتھ باوقار زندگی گزاری۔ اُن کو اپنی راست کرداری پر اعتماد تھا۔ چنانچہ میرے والدین نے بھی، انھیں قدیم روایات کے قضا میں جن کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، میری پرورش کی۔ میں نے اُن روایات سے علیحدہ ہونے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا۔ میں نے گھر کی چار دیواری کے باہر کی اپنی ہی جیسی اُن عورتوں کا ذکر نہ کیا تھا جو مردوں کی طرح آزادی سے باہر آتی جاتی تھیں۔ لیکن میں نے کبھی بھی اُن کے متعلق غور نہیں کیا۔ میں تو اپنے باپ دادا کے انھیں پرانے طریقوں پر چل رہی تھی جن کی مجھے تعلیم دی گئی تھی۔ باہر کی کسی بات کی مجھے کبھی ہوا بھی نہیں لگی اور مجھ کو کسی بات کی خواہش بھی نہیں تھی۔ لیکن آج جب میں بڑے شوق کے ساتھ ان عجیب و غریب مخلوق، ”جدید عورتوں“ کو دیکھتی ہوں، تو میں بھی انھیں جیسی ہی جانا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ تبدیلی بہن! میں اپنے لئے نہیں چاہتی بلکہ اپنے شوہر کی خاطر چاہتی ہوں۔

میں اُس کی نظروں میں خوبصورت نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے چاروں سمندر دوں کا سفر کیا ہے اور بڑے بڑے ملکوں کی سیاحت کی ہے اور اُن دور و دراز ملکوں میں اُس نے جدید چیزوں سے محبت کرنا سیکھا ہے۔

میری ماں ایک عقلمند عورت ہے۔ جب میں نے اپنی زندگی کی دس بہاریں ختم کیں اور بچی سے بڑھ کر جوان لڑکی بنی تو میری ماں نے ایک دن مجھ کو بتلایا کہ ”عورت کو مرد کے سامنے پھول کی طرح پر سکوت رہنا چاہئے اور جس قدر جلد ہو سکے عورت خوبصورتی کے ساتھ مرد کے پاس سے ہٹ جائے“ چنانچہ جب میں اپنے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی تو مجھے اپنی ماں کے الفاظ یاد آ گئے۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور دونوں ہاتھ سامنے رکھ لئے۔ میں نے اُس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ لیکن آہ! اُس نے تو میری خاموشی کو حاکم پر محمول کیا۔

جب میں اپنے دماغ پر زور دیکر ایسی باتیں سوچتی ہوں، جن سے میرے شوہر کو کچھ دلچسپی ہو سکے تو اس وقت میرے دماغ کی کیفیت دھان کے اُس سنسارہ کیفیت کی سی ہوتی ہے جس کی فصل کافی جا چکی ہو۔ جب میں تنہا بیٹھ کر کشیدہ کاری کا کام کرتی ہوں تو میں بہت سو اچھی اچھی باتیں اپنے شوہر سے کہنے کو سوچتی ہوں۔ مثلاً یہ کہ مجھے اُس سے کسی قدر محبت ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ بات میں کھلے بندوں، اُس حیا سوز انداز میں کہہ سکتی ہوں، جو خوشوار مغربی انداز گفتگو کی نقل ہو۔ میں تو چھپے الفاظ میں کہوں گی۔

ہر! تم نے آج طلوع آفتاب پر غور کیا؟ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بے جا زمین آفتاب سے ہم آغوش ہونے کے لئے اُچھل پڑی۔ تاریکی۔ اور پھر موسیقی

کی تان کی طرح روشنی کا جلال انگیز اُبھار میرے سرتاج! میں بھی تمہارے انتظار میں، بے جان زمین ہی کی طرح ہوں۔

یاد ہے جب کنول والی جھیل میں وہ کشتی پر میرے کمرے پر رہا ہو گا تو میں اُس سے کہوں گی کہ: ”کیا ہو اگر زرد مضمحل پانی کبھی بھی نہ محسوس کرے کہ چاند اس کو اپنی طرف نہیں کھینچ رہا ہے؟ اور کیا ہو اگر چاند کی شعاعیں اپنے لس سے اُس کی موجوں کو پھر کبھی بھی حیات و جنبشیں؟ میرے سرتاج! تم اپنی حفاظت کو اور بحیرت میرے پاس واپس آ جاؤ۔ تمہارے بغیر میں بھی اسی پانی کی طرح زرد مضمحل اور بے جان ہو جاؤں گی۔“

لیکن جب میرا شوہر اپنے اجنبی دلائی لباس میں میرے پاس آتا ہے تو میں یہ سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میری شادی کسی بدیشی آدمی کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ بہت کم باتیں کرتا ہے اور بولتا ہے تو وہ بھی لاپرواہی کے ساتھ۔ اس کی آنکھیں تیزی سے میری طرف سے ہٹ جاتی ہیں۔ اگرچہ اُس وقت میرے جسم پر شفا لو کے رنگ کی اٹلس ہوتی ہے اور میرے بال تازے تازے موتیوں میں گندھے ہوتے ہیں۔

یہ میرا دکھڑا ہے۔ ابھی میری شادی کو پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور میں اُس کی نظروں میں حسین نہیں رہی۔

تین دن غور و فکر کے بعد بہن میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اپنے شوہر کو متوجہ کرنے کے لئے مجھے عیاری سے کام لینا چاہئے۔ کیا میں اُن باعزت عورتوں میں نہیں ہوں جو پستہ پست سے اپنے شوہروں کی نظروں میں عزت کی مالک ہوتی جی آئی ہیں؟ سیکڑوں برس کے عرصہ میں کوئی بھی عورت ایسی نہیں پیدا ہوئی جو حسین نہ رہی ہو، سو ایک کوئی می (Mee - Nee) کے جو عہد سنگ میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے چہرے کو تین ہی برس کے سن میں چپکے کے داغوں نے برباد کر دیا تھا۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کی آنکھیں سیاہ جواہرات کی طرح تھیں اور اس کی آواز سے مردوں کے دلوں میں اس طرح ارتعاش پیدا ہوتا تھا، جیسے بہار کے موسم میں لمبے لمبے بانس ہوا کی جنبش سے ہٹتے ہیں۔ اگرچہ اُس کے شوہر کے پاس اُسکی دولت و ثروت کے عین مطابق چھ داشتہ عورتیں تھیں مگر اُس کو سب سے زیادہ محبت اپنی بیوی سے تھی۔ اور میرے باپ دادا کی ماں، یا نگ کیوی فی، جو اپنی کلانی پر ایک سفید چڑیا لے رہا کرتی تھی۔ اُس کی معطر ٹھیکوں میں تو پوری سلطنت تھی کیونکہ شہنشاہ ”آسمان کا بیٹا“ اُس کے حُسن کا دیوانہ تھا۔ میں بھی تو آخر اُنھیں باعزت عورتوں کی نشانی ہوں، میرا خون بھی تو اُنھیں کا خون ہے اور میری ہڈیاں بھی تو اُنھیں کی ہڈیاں ہیں۔

میں نے اپنے پتیل والے آئینہ میں اچھی طرح اپنے جسم کا معائنہ کیا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر لوگ مجھ سے بھی کم خوبصورت ہیں۔ میری آنکھوں کی سیاہی دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے بہت واضح ہے۔ میرے کان چھوٹے ہیں اور نواک کے ساتھ اس طرح سر سے ہوتے ہیں کہ جواہرات اور سونے کی بالیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ کاش میرا رنگ اتنا زرد نہ ہو اور میری پھوپھیں ذرا اور گنپی کی طرف بڑھی ہوتیں۔ لیکن میں اپنی ہتھیلی کی مدد سے لمبی سرخی گالوں پر مل کر زردی کا عیب چھپا لیتی ہوں اور پلکوں پر بھی میں برش سیاہی میں ڈبو کر پھیر لیا کرتی ہوں۔

پھر تو میں کافی حسین ہو جاتی ہوں اور اُس کی آمد کا انتظار کرتی ہوں۔ لیکن جب اُس کی نگاہیں مجھ پر پڑتی ہیں تو میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ یہ سب بالکل نہیں دیکھتا۔ اُس کی نظریں نہ تو لب ہی پر پڑتی ہیں نہ کہ آنکھوں پر۔ اُس کا خیال زمین پر رہتا ہے، سمندر پر رہتا ہے اور ہر اُس جگہ رہتا ہے جہاں میں نہیں ہوتی ہوں۔

جب وہ دن آیا جو رات بچہ بنانے والوں نے میری شادی کے لئے مقرر کیا تھا تو سُرخ شراب بوتلوں میں بھری گئی، میزوں پر گلہابی پھولدار اٹلس کے میز پوش ڈالے گئے اور شادی کے ایک جو بالکل گلوڈ کی طرح بنے تھے تو میری ماں نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ دھوئے اور بال از سر نو درست کئے پھر میں اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوئی وہ ایک سیاہ نقش کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ بغل میں دیوار کے قریب اُس کا روپہلا کاردار بانس کا حقہ رکھا تھا۔ آنکھیں چار کرنے کی جرأت کے بغیر سر جھکا کر میں اُس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ماں کی آنکھیں سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی ہیں۔ باوجود خاموشی کے اُس کی نگاہوں کی تیز گرمی میرے دل کے اندر اُترتی جا رہی تھی۔ بالآخر میری ماں نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اُس کی بغل میں ایک چھوٹی میز پر کچھ تروبوڑ کے بیج رکھے تھے، وہ اُن سے شغل کر رہی تھی اور اُس کا چہرہ حسب معمول ایک مہم غم کا آئینہ دار تھا۔ میری ماں عقلمند ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ: ”بیٹی کیوی آئیں! آج تمہاری شادی اُس شخص کے ساتھ ہو رہی ہے، جس سے تم پیدا ہونے سے پہلے ہی منسوب ہو چکی تھیں۔ تم دونوں کے باپ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ اُن میں بھائی چارہ تھا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کے بچوں کے ساتھ شادی کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اُس وقت تمہارے سنگیتر کی عمر چھ سال تھی اور پھر اُسی سال تم بھی پیدا ہوئیں۔ گویا پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ رشتہ تمہارے لئے مقسوم ہو چکا تھا اور میں نے ہمیشہ اسی مقصد کے پیش نظر تمہاری پرورش و پرداخت کی ہے۔

تمہاری زندگی کے گزشتہ سترہ برسوں میں تمہاری شادی کا یہ لمحہ بد وقت میرے ذہن میں رہا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کی میں نے تم کو تعلیم دی ہے، اُن میں دو شخصیتوں کا

الفاظ بیدار ہوتے اور اُن کا مجرم نوکر پر وہی اثر ہوتا جو برف کے ایک نوکیلے ٹکڑے کا گوشت پر ہوتا ہے۔

مجھ پر اور میرے بھائی پر وہ بیدار ہوا تھا، لیکن وہ اس کا اظہار نہ کرتی، اور یہ طریقہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ پورے خاندان میں اُس کا درجہ سجدہ اعلیٰ تھا۔ اُس کے چہرے پر بیدار ہونے، لیکن چار بچوں کو موت کے ظالم دیوتا نے بچپن ہی میں اُس سے چھین لیا تھا۔ ان حادثات نے ہم لوگوں کی وقعت اُس کی نظروں میں اور بھی بڑھادی تھی۔ کیونکہ جب تک ہم میں سے ایک بھی باقی تھا اُس وقت میرے باپ کو قانوناً اُس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ وہ ظاہر نہ کرتی لیکن درپردہ اُس کو اپنے لڑکے پر سجدہ نازل تھا۔

تم نے تو میرے بھائی کو بھی دیکھا ہے نا؟ ماں کی طرح دبلا پتلا ویسی ہی نازک نازک ہڈیاں، لباس کی توخیز شاخ کی طرح لانا اور سیدھا۔ بچپن میں ہم سب ایک جگہ رہتے تھے اور یہ اُس نے سب سے پہلے مجھے اُن حروف پر روشنی پھیرنا سکھایا جو میری پہلی کتاب میں بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ لڑکا تھا اور میں لڑکی، اُس نے جب وہ نو برس کا ہو گیا تو وہ مردانہ مکان میں رکھا جانے لگا جہاں میرا باپ رہتا تھا۔ پھر تو ہم لوگوں کی ملاقات بہت کم ہونے لگی۔ اب وہ بڑا بھی ہو گیا تھا اور عورتوں سے ملنے شرما رہا تھا۔ اور میری ماں بھی اب باتوں کی بہت افزائی نہ کرتی تھی۔

مجھ کو کبھی بھی گھر کے اُس حصہ میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں مرد رہتے تھے۔ جب مجھ کو میرے بھائی سے جدا کیا گیا تو میں ایک مرتبہ شام کے دھندلکے میں خاموشی کے ساتھ اُس دروازہ کی طرف گئی جو مردانہ مکان میں کھلتا تھا اور دیوار پر جھک کر باہر کی طرف اس اسید میں جھانکنے لگی کہ شاید میرا بھائی باغ میں ٹھکانا نظر آجائے۔ لیکن مجھ کو صرٹ وہ نوکر نظر آئے جو گرم گرم کھانے برتنوں میں لئے ہوئے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ جب اُن نوکروں نے میرے باپ کے بال کا دروازہ کھولا تو قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں، اور انھیں آوازوں میں گانے والی عورت کی سریلی آواز بھی ملی جلی تھی۔ جب دروازہ بند کئے گئے تو پھر باغ میں سناٹا ہو گیا۔

میں بڑی دیر تک کھانے والوں کے قہقہے سننے کے انتظار میں کھڑی رہی اور یہ سوچ رہی تھی کہ شاید ان مسرت بخش آوازوں میں میرے بھائی کی بھی آواز موجود ہو کر پکائی کسی نے بڑی تیزی کے ساتھ مجھ کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ یہ میری ماں کی سب سے بڑی خادمہ وینگ ڈانا تھی۔ اُس نے ڈانٹ کر کہا کہ ”اب اگر میں نے دیکھا تو تمھاری ماں سے کہہ دوں گی۔ کسی نے آج تک ایسی بے حیا لڑکی نہ دیکھی ہوگی جو مردوں کے لئے تانک جھانک کرتی ہو۔“

”میں تو اپنے بھائی کو تلاش کر رہی تھی“ میں نے حاجت کے ساتھ کہا اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”لیکن اب تمھارا بھائی بھی مرد ہے۔“

چنانچہ اب میں اُس کو بہت کم دیکھتی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے سنا کہ اُس نے چاروں کتابوں اور پانچوں علوم کی تعلیم حاصل کر لی ہے، اور میرا باپ اُس کو پیکنگ کے بریشی اسکول میں داخل کرانے کے لئے بھی طیارہ موگیا ہے جس کی میرے بھائی کو بید خواہش تھی اور جس کے لئے اُس کو اپنے باپ کی بڑی منت و ساجت کرنی پڑی تھی۔ میری شادی کے وقت وہ پیکنگ کی نیشنل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ہر خط میں امریکہ جانے کی اجازت چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو میرے والدین اس طرف توجہ بالکل ہی نہ کرتے تھے، خصوصاً میری ماں تو اس کے بہت خلاف تھی۔ لیکن میرے باپ کو جھگڑوں سے بید نفرت ہے، چنانچہ اس قدر کوٹے کرنے کے لئے اُس نے میرے بھائی کی خواہش قبول کر لی۔ میری شادی سے پہلے اُس نے اپنی دو تعطیلاتیں جو گھر پر گزاریں، اُن میں ایک کتاب کا وہ بہت ذکر کیا کرتا تھا جس کو وہ ”سائنس“ کہتا تھا۔ میری ماں ان باتوں کو بے قسمی سے تعبیر کرتی تھی کیونکہ اُس کے خیال میں چینی شرفاء کے لئے مغربی علوم کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری بار جب وہ گھر آیا تو مغربی لباس پہنے تھا میری ماں اس بات سے بہت ناراض ہوئی۔ جب وہ اس لباس میں کمرے کے اندر داخل ہوا تو بالکل اجنبی اور غریب سا نظر آتا تھا۔ میری ماں نے اپنی چھڑی زمین پر مارتے ہوئے غصہ سے کہا:

”یہ کیا ہے؟ آخرش یہ کونسا طریقہ ہے؟ میرے سامنے آیتہ ایسے پہل لباس میں ہرگز نہ آنا۔“

مجبوراً اُس کو لباس تبدیل کرنا پڑا، اگرچہ یہ اُس کو سید گراں گزرا اور مارے غصہ کے وہ دو دن اندر نہیں آیا۔ بالآخر میرے باپ نے منس کر اُس کو سمجھایا اور اندر جانے کا حکم دیا۔ میری ماں بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ چینی لباس میں میرا بھائی شرفاء اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ بریشی لباس میں اُس کی ٹانگیں کھلی رہتی تھیں اور وہ عجیب طرح کا معلوم ہوتا تھا، اس طرح کا انداز آج تک نہ تو کسی نے میرے خاندان میں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔

ماں تو اُن دونوں تعطیلاتوں کے موقعوں پر بھی اُس نے بہت کم باتیں کیں۔ میں اُن کتابوں سے قطعاً نااہل تھی جن کا وہ دلدادہ تھا، کیونکہ مجھے انھیں باتوں کے سیکھے سے فرصت نہ ملتی تھی جن کا شادی سے پہلے سیکھ لینا ضروری تھا، پڑھنے لکھنے کا کیا سوال تھا۔

اُس کی شادی کے متعلق ہم لوگوں نے کبھی کوئی گفتگو نہیں کی کیونکہ ایک جوان لڑکے اور جوان لڑکی کے درمیان شادی کی گفتگو نامناسب تھی۔ ماں میں نے نوکروں کی ذہنی

بہتر و سنا تھا کہ وہ بغاوت کر رہا تھا اور اسی نہیں کرنا چاہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری ماں کو شادی کی تاریخ تین مرتبہ مقرر کر کے بڑھائی پڑی تھی۔ ہر مرتبہ میرے بھائی نے باپ کو خبر کیا کہ دوران تعلیم میں اُس کو شادی کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ میں یہ ضرور جانتی تھی کہ اُس کی شادی کی خاندان کی منجھلی لڑکی سے طے ہو چکی ہے اور یہ خاندان شہر میں اپنی دولت اور نام کے لئے مشہور ہے۔ تین پشت اُدھر ہمارے خاندان اور فی خاندان۔ ہر گھر و جوار کے اضلاع کے گورنر تھے۔

ہم لوگوں نے اپنے بھائی کی منگیتر کو اب تک نہیں دیکھا تھا، کیونکہ شادی کا منہ امرے باپ نے اُس وقت طے کیا تھا جب میرا بھائی صرف ایک سال کا تھا۔ اور معاملہ طے ہو جاتا۔ بعد شادی ہونے سے پہلے اُن دونوں گھرانوں میں آمد و رفت کیسے ہوتی کیونکہ یہ ایک نازیبا بات تھی۔

ہمارے گھر میں بھی اُس لڑکی کا کوئی ذکر نہ کیا جاتا۔ میں نے صرف ایک بار بڑی خادمہ وانگ ڈاما کو دوسرے نوکرانوں سے کہتے سنا تھا کہ ”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ لڑکی ہمارے نوجوان آقا سے تین سال عمر میں بڑی ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو شوہر کو بڑا ہونا چاہئے۔ لیکن کیا کیا جائے، خاندان پرانا اور رئیس ہے اور پھر۔۔۔“

یہ ایک اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا بھائی شادی سے کیوں انکار کر رہا ہے۔ جب میرے باپ کی بڑی داشتہ نے یہ سنا تو ہنس کر اُس نے کہا:۔۔۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے پکینگ میں کوئی حسین بیوی تلاش کر لی ہے۔“

لیکن میں یہ کبھی بھی یاد نہیں کر سکتی تھی کہ میرا بھائی سوا کتابوں کے کسی اور سے بھی محبت کر سکتا تھا۔ چنانچہ زمانہ مکان کی چار دیواری کے اندر میں تنہا جوان ہو رہی تھی۔ گھر میں میرے باپ کی داشتہ عورتوں کے بھی بچے تھے لیکن میں جانتی تھی کہ میری ماں ان لوگوں کا خیال صرف غسل تولانے کے وقت کرتی تھی جب اُس کو سوچنا پڑتا تھا کہ گتے آدمیوں کے لئے چادل، تیل اور نمک وغیرہ دیا جائے یا کچھ کبھی اُن لوگوں کے کپڑوں کے لئے چند گز سادہ آسانی سوتی کپڑے دیدئے جاتے۔

داشتہ عورتیں تھیں بھی بڑی جاہل، وہ ہر وقت آپس میں لڑا کرتیں اور میرے باپ کی محبت میں اُن سب کا جو حصہ تھا اُس کے لئے وہ ایک دوسرے سے بید حسد کرنی تھیں۔ اُن لوگوں نے میرے باپ کو اپنے حُسن سے متوجہ کیا تھا، لیکن اُن کا حُسن اُس پھول کی طرح اپنی جاذبیت کھو رہا تھا جس کو موسم بہار میں توڑ لیا جائے۔ چنانچہ جوں جوں اُن کے حُسن میں کمی آتی گئی میرے باپ کی محبت بھی سرد ہوتی گئی۔ لیکن خود اُن لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کبھی بھی نہ آئی کہ اُن کا حُسن ختم ہو چکا ہے اور وہ لوگ میرے باپ کی آمد۔ کئی روز پہلے اپنے زیور اور لباس کی درستگی میں لگ جاتیں۔ میرا باپ دعوتوں کے موقع پر اُن سب کو روپے دیتا اور جب کبھی وہ خوش قسمت رہے جوئے میں کافی رقم پا جاتا تو بھی اُن لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتا۔ لیکن یہ سب روپے وہ لوگ بڑے احمقانہ انداز سے مٹھائیوں اور شراب پر صرف کر دیتیں جس کی وہ شاہوت نہیں اور جب یہ میں ختم ہو جاتیں تو پھر وہ عورتیں میرے باپ کی آمد سے قبل زیور، جوتے اور لباس خریدنے کے لئے نوکروں سے قرض لیتیں۔ جب نوکروں کو بھی اس کا احساس ہو جاتا کہ اُن کے اُفاق کی نظروں میں اب ان عورتوں کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے تو وہ بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے اور پھر تو بڑی دقت کے ساتھ وہ قرض کی معاہدہ کرتے۔

سب سے بڑی داشتہ جو سب سے زیادہ پُرانی بھی تھی، بید موٹی تھی، اُس کا چھوٹا سا چہرہ پھوٹے پھوٹے گالوں کے پہاڑوں میں چھپ گیا تھا، اُس کے ہاتھ بہت پھوٹے اور بہت خوبصورت تھے، جن پر اُس کو نازی بھی بہت تھا۔ وہ ہاتھوں کو تیل سے دھو کر ہتیلی میں خوبصورتی کے ساتھ منہدی رچاتی اور چکنے بیضادی ناخنوں میں سرخی لگاتی اور پھر ہاتھوں کو میگوئی کے عطر میں اچھی طرح بساتی۔

بعض اوقات میری ماں اس عورت کے بیجا غور سے عاجز آ کر کپڑے دھونے یا کپڑے سینے کا کام اُس کو دیتی، اس معاملہ میں کچھ تھوڑی سی اُس کی برفی بھی یقیناً شامل ہوتی۔ موٹی بھدی عورت میری ماں کے حکم سے سرتابی کی توجہ نہ کرتی لیکن دوسری عورتوں سے کہتی کہ میری ماں اُس سے جلتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا حُسن ختم ہو جائے تاکہ اُس کے شوہر کی نظروں سے وہ گر جائے۔ یہ باتیں وہ کام سے نارغ ہونے کے بعد ہاتھ صاف کرتے وقت کہتی۔ اُس وقت بہت غور کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتی کہ کہیں کھال موٹی یا کھردری تو نہیں ہو گئی ہے۔ میں اُس کے ہاتھ نہیں چھو سکتی تھی کیونکہ وہ بید گرم اور نرم تھے، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مٹھی کے اندر گل کر رہ جائیں گے۔

اس عورت سے میرے باپ کو اب کوئی محبت نہ تھی لیکن جب کبھی وہ اُس کے پاس جاتا تو کافی قسم اُس کو دیدیتا تاکہ وہ صحن میں کھڑی ہو کر اپنی بھدی آواز سے اُس کو پریشان دکرے اور طنز و تشنیع سے اُس کا سر نہ کھائے۔ اور پھر اُس کے دو بچے بھی تھے اس لئے وہ کچھ نہ کچھ توجہ کیوں بھی مستحق تھی۔

اس کے لڑکے سوٹے تھے، بالکل ماں کی طرح۔ وہ ہر وقت کھاتے پیتے رہتے۔ سب کے ساتھ میز پر وہ پورا پیٹ کھاتے اور پھر نوکروں کے کمروں میں گھس کر بچے کچھ کھانے کے ٹکڑوں کے لئے اُن سے لڑتے۔ میری ماں کو طبع سے جیسے نفرت ہے اس لئے وہ ان لڑکوں سے بہت نفرت کرتی چنانچہ وہ لوگ اُس کے ڈر کے مارے بہت ہوشیاری کے ساتھ گھر میں رہتے۔ خود میری ماں بہت کم خود آک تھی۔ وہ تھوڑا سا چادل مچھلی کے ایک ٹکڑے یا چڑیا کے ٹھنڈے گوشت کے ساتھ کھاتی اور تھوڑی سی چائے پی لیتی۔

مجھے اپنے باپ کی دوسری داشتہ کے متعلق زیادہ نہیں یاد ہے۔ وہ مرنے کے خیال سے بہت ڈرتی تھی اور اُس کے ساتھ ہی مٹھائیاں اور تل کے روغنی لڈو بہت کھاتی تھی اور جب بیمار پڑتی تو ڈر کے مارے چلاقی بیٹتی۔ اس موقع پر وہ بیماری کو ملا کر وعدہ کرتی کہ اگر وہ اچھی ہو گئی تو اپنے موتی جس سے وہ بال سنوارتی ہے، مندر میں چڑھائیگی اور اب کبھی بھی بد پرہیزی نہ کرے گی، لیکن اچھی ہوئے ہی وہ اپنا وعدہ بھول جاتی اور پھر وہی چیزیں کھانے لگتی۔

میرے باپ کی یہ دوسری داشتہ جو اُس کی تیسری بیوی تھی، بہت کم باتیں کرتی اور گھر کے معاملات میں بھی بہت کم دلچسپی لیتی وہ چار لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ماں تھی۔ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ ان بچوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی جاتی اور اُن کی حالت اُن غلاموں سے کچھ ہی بہتر تھی جن کو ہم لوگوں نے خرید لیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے بچے کی تیمارداری میں گزارتی۔ بچہ بیماری اور زرد تھا، اُس کی عمر تین برس کی تھی لیکن وہ چل بھی نہیں پاتا تھا۔ وہ بہت روتا اور ہر وقت ماں کے طویل اور ڈھبے سینے سے دھکا رہتا۔

مجھے اپنے باپ کی تیسری داشتہ بہت پسند تھی۔ وہ سوچاؤ کی ایک رقاہ تھی اور اس کا پیدائشی نام لاتے تھا اور یقیناً وہ لاتے کے اُس بھول کی طرح حسین تھی جس کی بزنہ شاخوں سے اوائل موسم بہار میں سنہری زرد کلیاں نکلتی ہیں۔ وہ بالکل اُنھیں کلیوں کی طرح نازک و لطیف تھی۔ وہ دوسری عورتوں کی طرح اپنے گالوں پر سرخی نہ لگاتی ماں ابرو پر ایک باریک سیاہ خط ضرور کھینچ دیتی اور لبوں پر سرخی بھرتی۔ شرم سے ہم لوگ اُس کو بہت کم دیکھتے تھے۔ کیونکہ میرے باپ کو اس کے حسن پر سجدہ ناز تھا اور ہر جگہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ میری شادی سے ایک سال پہلے اُس نے گھر پر رہنا شروع کیا تھا کیونکہ اب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اُس کا بچہ موٹا تازہ اور خوبصورت تھا۔ وہ بچے کو محبت کے ساتھ کھلاتی اور باپ کی آغوش میں دیدیتی، گویا میرے باپ نے زیور اور جواہرات کی شکل میں اُس کو جو کچھ دیا تھا یہ اُس کا معاوضہ تھا۔

بچہ پیدا ہونے سے قبل اُس پر ہر وقت ایک سرور کی سی کیفیت طاری رہتی اور وہ ہنسا کرتی۔ ہر جگہ اُس کے حسن کا چرچا رہتا اور یقیناً وہ حسین تھی میں نے آج تک اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔ سبز ساٹھ اور سیاہ مخمل کے کپڑوں کے ساتھ اپنے حسین کانوں میں جواہرات پہنتی۔ اگرچہ ہم لوگوں سے ایک گونہ اُس کو نفرت تھی مگر اس کے باوجود وہ بڑی فیاضی کے ساتھ ہم لوگوں کو مٹھائیاں اور دوسری چیزیں دیتی جو رات کی اُن دعوتوں میں اُس کو ملتیں جن میں وہ میرے باپ کے ساتھ شریک ہوتی۔ وہ خود بہت کم کھاتی تھی۔ صبح کو میرے باپ کے جانے کے بعد تل کی ایک ٹکلیا اور دوپہر کو تھوڑا سا چاول بانس کی پھلیوں یا بٹ کے گوشت کے ساتھ۔ ماں اُس کو بدیشی شرابوں کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر میرے باپ سے زرد پیلے رنگ کی وہ شراب خریدنے کی استدعا کرتی جس کی تہ سے نفرتی بیلے اٹھ اٹھ کر اوپر کی طرف آتے ہیں۔ شراب پینے کے بعد وہ بہت ہنستی، بہت باتیں کرتی اور اُس کی آنکھیں سیاہ پتھر کی طرح چمکے لگتی ہیں۔ اُس کی ان حرکتوں سے میرا باپ بہت مسرور ہوتا اور اس کو رقص کرنے کا حکم دیتا۔

جس وقت میرا باپ ان دعوتوں میں ہوتا میری ماں اپنے کمرے میں بیٹھی کفنوشش کے زریں اقوال کا مطالعہ کرتی۔ مجھ کو اپنے بچپن میں راتوں کی یہ دعوتیں کچھ پر اسرار سی معلوم ہوتیں اور جی چاہتا کہ جھانک کر دیکھوں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے اپنے بھائی کو ڈھونڈتے ہوئے ایسا کیا بھی تھا۔ میں یہ جانتی تھی کہ میری ماں اس کو پسند نہیں کر سکتی، اس نے مجھ کو تھوڑی سی شرمندگی بھی ہے۔

ایک رات پھر۔ مجھ کو اپنی اس نافرمانی پر بڑی شرمندگی ہے۔ گرمیوں کی تاریک رات تھی، میں خاموشی کے ساتھ مردانہ مکان کی طرف گئی اور جھانکنے لگی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جذبہ میرے اندر کیوں پیدا ہوا، اس مرتبہ تو بھائی کی تلاش کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ ایک عجیب مبہم ساجذہ تھا، جس نے موسم گرما کے طویل دن میں صبح سے شام تک مجھ کو پریشانی دہیپن رکھا اور جب شام، گرمی، دھندلے پن اور کنول کے پھولوں کی خوشبو سے بس آئی تو زنا تہ مکان کی خاموشی میں مجھ کو مردنی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے جھانکنا شروع کیا تو میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی۔ کمرے کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اور سیڑیوں لالٹینوں کی روشنی باہر کی گرم اور ساکن فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کے اندر لوگ چوکور میزوں پر بیٹھے کھانی رہے ہیں اور نوکر بہر طرف کھانوں سے لبریز برتن لے دوڑ رہے ہیں۔ ہر جہان کی پشت پر انگور کی بیل کی طرح ایک نازک لڑکی کھڑی ہے اور صرف ایک عورت کھانے کی میز پر میرے باپ کی بغل میں بیٹھی ہے یہ لاتے تھی۔ مجھ کو اُس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم تھا۔ جب وہ میرے باپ کی طرف گھومتی تو اس کا چہرہ موی بھول کی طرح معلوم ہوتا۔ اس نے کچھ آہستہ سے کہا، اتنا آہستہ کہ اُس کے لب بھی شکل ہی سے کھلے تھے، لیکن پوری محفل تہقہوں سے گونج اٹھی۔ لیکن اُس کے تبسم کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، وہی لطافت و نزاکت برقرار رہی اور وہ کھل کر نہ ہنستی۔

اس موقع پر خود میری ماں نے مجھ کو کپڑا لیا۔ وہ بہت کم اپنے کمرے سے نکلتی۔ صحن میں بھی ٹہلنے کے لئے نہ آتی، لیکن آج شاید موسم کی گرمی نے اُس کو کمرے سے نکال دیا اور اس کی نظریں مجھ پر پڑ گئیں۔ اس نے مجھے فوراً کمرے میں واپس جانے کا حکم دیا اور خود بھی میرے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ ہاتھ میں کھجور کا پنکھا لے تھی، اُسی سے اُس نے میرے ہاتھوں پر زور سے مار کر کہا کہ ”طوافوں کو دیکھنے کا شوق ہوا ہے۔“ اس کی نظریں سید حقارت آمیز تھیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسرے دن اُس نے وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیا اور اب پھر میں اُس طرف سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میری ماں بھی اپنے شوہر کی تیسری داشتہ پر بہت مہربان تھی۔ گھر کے ملازمین کو اس پر حیرت بھی تھی۔ دوسری داشتہ عورتیں تو شاید اس سے خوش ہوتیں کہ میری ماں اُس کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آئے، جیسا کہ گھر کی مالک ہونے کی حیثیت سے اُس کو کرنا چاہئے تھا۔ لیکن میری ماں شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

میرے باپ کی تیسری داشتہ کا خیال تھا کہ بچہ ہونے کے بعد میرے باپ کی نظروں میں اُس کی وقعت اور بھی بڑھ جائے گی اور وہ برابر اپنے ساتھ اُس کو ہر جگہ لے جانا شروع کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بچہ کی پرورش کر کے اپنے حُسن کو برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بچہ کی پرورش کا کام ایک لونڈی کے سپرد کیا۔ اس عورت کے بھی ایک بچہ تھی لیکن اُسکو ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بڑی موٹی عورت تھی اور اُس کا دھانہ جانوروں کا سا تھا، لیکن بچہ رات بھر اس کی آغوش میں سویا کرتا اور دن بھر اُس کی گود میں پڑا رہتا۔ خود اُس کی ماں بچے کی طرف بہت کم متوجہ ہوتی کبھی کبھی میلے ٹھیلے کے موصوں پر وہ اپنے ہاتھ سے اُس کو سرخ کپڑے پہناتی اور اُس کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے پلے کے منہ جیسے جوتے ڈال دیتی۔ دن میں کسی کسی وقت وہ اُس کو کھلا لیا کرتی تھی اور جب وہ رونے لگتا تو جلدی سے وہ اُس کو لونڈی کی گود میں دیدیتی۔

بچہ ہونے کے بعد میرے باپ کی توجہ اُس کی طرف کم ہو گئی۔ اگرچہ قانوناً میرے باپ کی غنائیتوں کا بدل اُس نے لڑکے کی شکل میں دیدیا تھا۔ اب اُس کو بھی اور عورتوں کی طرح، میرے باپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے داؤں کرنے پڑتے۔ یقیناً اب وہ اس قدر حسین نہیں رہی تھی جس قدر بچہ ہونے سے پہلے وہ تھی اور اُس کے چلنے، مونی جیسے چہرہ سے شباب کی آب و تاب رخصت ہو چکی تھی۔ وہ سبز بادہ پہنتی، کانوں میں کرن پھول لٹکاتی اور اُسی جھنکار کے ساتھ ہنستی۔ میرا باپ بھی ظاہراً پہلے ہی کی طرح خوش تھا لیکن جب وہ دوسری مرتبہ پھر سفر پر گیا تو اُسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔

استعجاب اور غصہ نے اُس کی صورت خوفناک بنا دی تھی۔ دوسری داشتہ عورتیں مسکرا مسکرا کر اس کی تسلی و تسفی کر رہی تھیں اور بہت خوش تھیں لیکن میری ماں کچھ معمول سے زیادہ مہربان تھی۔ میں نے وانگ ڈاؤ کو غود یہ کہتے سنا کہ:۔ ”ہاں! یقیناً ہم لوگوں کو اب ایک کسی اور عورت کو کھلانا پلانا پڑے گا کیونکہ اب اُس کا دل اس چھوٹے سے بھی بھر گیا، اُسی دن سے جو تھی داشتہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی غصہ و غضب کی پیہم کیفیت نے اور زمانہ مکان کی خشک و بنے ہوئے فصل نے اُس کے اندر بد دلی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ تو دعوتوں میں جانے کی اور مردوں سے تعریفیں سننے کی عادی ہو گئی تھی۔ روز بروز اُس کی المٹائی بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک دن اُس نے جان ہی دینے کا ارادہ کر لیا، اگرچہ یہ قصہ میری شادی کے بعد کا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں ہم لوگوں کی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ہم لوگ بیکار و خرم تھے اور ہمارے بہت سے ہمسائے میری ماں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے۔ میرا باپ بھی اپنی بیوی کی ذہانت اور خانگی معاملات میں اُس کی کارکردگی کو بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھتا۔ میری ماں نے کبھی اُس کو کسی بات پر بھی ملامت نہیں کی۔ غرض اُن دونوں کی زندگی سید پر امن اور باعزت تھی۔

آہ میرا پیارا گھر! میرا بچپن میری نظروں کے سامنے تصویر کی طرح گزر رہا ہے۔ وہ صحن جہاں میں کنول کی کلیوں کو تالاب کے اندر طلوع آفتاب کے وقت پھول بنے دیکھا کرتی تھی، زمانے مکان کے کمرے جس کی کچی زمین پر بچے قلا بازیاں کھیلا کرتے تھے، گھر کے دیوتاؤں کے سامنے وہ موسیٰ مٹیوں کا جلا یا جانا، اور پھر میری ماں کا کمرہ جہاں میں اُس کے حاکمائے گمراہ چہرے کو کسی کتاب پر جھکا ہوا دیکھتی اور وہاں اُس کی بغل میں ایک بھاری چٹنگیری لگا ہوا پلنگ بھی نظر آتا۔ یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہے۔

سب سے زیادہ عزیز مجھ کو مہانوں والا کمرہ تھا، جہاں سیاہ رنگ کی کرسیاں اور بھاری بھاری کوحیں پڑی ہیں اور ایک بڑی نقشہ میز سجھی ہوئی ہے اور دروازہ پر سرخ ساٹن کے پردے پڑے ہیں۔ میز کے قریب ہی دیوار پر پہلو تنگ شہنشاہ کی قلمی تصویر لٹک رہی ہے۔ ایک ناقابلِ تسخیر چہرہ اور ٹھنڈی جیسے کوئی پہاڑی ٹیلہ اور تصویر کے چاروں طرف ایک سنہرا پار پڑا ہوا ہے۔ ہال کے جنوبی حصہ کی گھر لکیاں سب کی سب نقشہ ہیں اور چاول کے کاغذ ان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہال کی عظمت تاریکی میں چاند کی روشنی اسی کاغذ سے چھین چھین کر داخل ہوتی ہے اور چیت کی بھاری بھاری کڑیوں تک پہنچ کر اُن کے سنہرے حاشیوں کو جگمگا دیتی ہے۔ اپنے بزرگوں کے اس ہال میں بیٹھ کر شام کے سکوت میں شفق کا نظارہ کرنا، مجھ پر موسیقی کی کیفیت طاری کرتا ہے۔

نور دن کے دن جب شریف عورتیں ایک دوسرے سے ملنے جاتی ہیں تو یہ ہال سجایا جاتا ہے۔ لاتعداد عورتیں رنگ رنگ کپڑوں میں ملبوس آتی ہیں اور پورا ہال روشنی اور تھقہ بھری سے لبریز ہو جاتا ہے۔ باغیاں تقریباً تشریوں میں سب کے سامنے لٹکی ہوئی ہیں۔ میری ماں متین اخلاق کے ساتھ اس اجتماع کی صدارت کرتی ہے۔ اس ہال کی پڑائی کڑیاں صدیوں سے اسی منظر کو دیکھتی آئی ہیں۔ کالے کالے سر، سیاہ سیاہ آنکھیں، قوس قزح کے سے ریشم و اطلس، جواہرات، موتی، بالوں میں پڑنے

جانے والے لعل اور ہاتھی دانت کے سے نازک ہاتھوں میں مرصع چوڑیاں۔

میرے پیارے گھر! میرے عزیز گھر! — میں خود اپنے کو دیکھتی ہوں، بھائی کے ہاتھوں سے لپٹی ہوئی ایک چھوٹی موٹی صورت صحن میں آگ کے پاس کھڑی ہے، جہاں باورچی خانے کے دیوتا روشن کئے جا رہے ہیں۔ اُن کے کاغذی لبوں میں خند لگا جاتا ہے تاکہ آسمانوں پر جا کر اُن کے منہ سے میٹھے بول نکلیں اور وہ یہ بھول جائیں کہ کبھی گھر کے نوکر آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے یا کبھی باورچی خانے میں چوری بھی کیا کرتے تھے۔ دور بہت دور، نامعلوم دنیا میں بھیجے جانے والے ان قاصدوں کے خیال سے ہم میں حیرت و استعجاب پیدا ہوتا لیکن ہم خاموش رہتے۔

”اڑدے کے تہوار“ کے موقع پر میں اپنے کو دیکھتی ہوں۔ جسم پر پیازی ریشم کا میرا وہ گاؤں ہے جس پر خوبصورتی کے ساتھ امار کی کلیاں کڑھی ہیں اور میں بتابی کے ساتھ شام کا انتظار کر رہی ہوں جب میرا بھائی مجھے دریا کے کنارے ”اڑدے کی کشتی“ کی سیر کرانے لے جائے گا۔

مجھے کنول کی طرح وہ قندیل یاد آتی ہے جو میری بوڑھی دایہ چراغوں کے تہوار کے موقع پر میرے لئے لایا کرتی تھی اور جس کو دیکھ کر میں اس خیال سے بے ساختہ کھل کھلا اُٹھتی تھی کہ رات کو میں اس کی سُرخ موی بتی روشن کروں گی۔

مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ آہستہ آہستہ عظیم الشان مندر کی طرف جانا یاد آتا ہے۔ وہ لوٹے میں خوشبودار پانی ڈالتی ہے اور میں اس کو غور سے دیکھتی ہوں پھر میں اپنی ماں کے ساتھ زابدانہ انداز میں زانو کے بل جھک جاتی ہوں اور خون میرے اندر سرد ہو جاتا ہے۔

بہن! میں تم سے بڑھتی ہوں کہ جب اس فضا میں میری ابتدائی زندگی کے ماہ و سال گزرے ہیں تو میں اپنے شوہر جیسے انسان کے لئے کیونکر موزوں ہو سکتی ہوں؟ میری تمام مختص ضایع گئیں۔ میں تنہائی میں سوچتی ہوں کہ آج اپنا سیاہ کوٹ پہنوں گی جس میں چاندی کے ہٹن بڑی خوبصورتی کے ساتھ ٹنکے لگے ہیں، بالوں میں پھولوں کا بار گونھوں گی اور پیروں کو نوکدار سیاہ ساٹن کے جوتوں سے آراستہ کروں گی۔ اور جب وہ آئے گا تو میں اس کے استقبال کے لئے کھڑی ہو جاؤں گی۔ لیکن جب وہ آتا ہے تو اس کی نظریں ان میں سے کسی چیز پر نہیں پڑتیں بلکہ تیزی کے ساتھ خطوط اور کتابوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور میں فراموش ہو جاتی ہوں۔

میرا دل ایک نامعلوم خون سے لبریز ہے۔ مجھے اپنی شادی سے قبل کا وہ دن یاد آتا ہے جب میری ماں نے اپنے تیز ہاتھوں سے دو خط لکھے تھے، ایک میرے باپ کے نام اور دوسرا میری ساس کے نام اور بہت جلدی جلدی دربان کی معرفت اُن کو روانہ کیا تھا۔ میں نے اس قدر پریشان اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسی دن میں نے گھر کی نوکروں کو کانا پھوسی کرتے سنا کہ میرا شوہر اس نسبت کو توڑنا چاہتا ہے کیونکہ میں جاہلی ہوں اور میرے پیر بندھے ہیں۔ میں یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور وہ سب گھبرا اُٹھیں اور قسمیں کھانے لگیں کہ یہ باتیں وہ میرے متعلق نہیں بلکہ میرے باپ کی دوسری داشتہ کی لڑکی کے متعلق کر رہی تھیں۔

میں عجیب پیچ و تاب کے ساتھ اس معاملہ پر غور کرنے لگتی ہوں۔ کیا یہ لوگ واقعتاً میرے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے؟ نوکر تو ہمیشہ کے جھوٹے ہوتے ہیں اور میں بالکل بے پڑھی بھی نہیں ہوں۔ مجھ کو امور خانہ داری کی پوری تعلیم دی گئی ہے اور بٹنے و سنورنے کا ہنر بھی سکھایا گیا ہے۔ وہ گیا میرے پیروں کا سوال، یقیناً کوئی بھی بھاری، موٹے اور مردوں جیسے پیر بندہ کرے گا۔ یہ لوگ یقیناً میرے متعلق باتیں نہیں کر رہے تھے۔ اس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

محمد عتیق صدیقی

(ترجمہ)

مطبوعات طاق لبناں

خواب کی دنیا: اس موضوع پر کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی مقام محمود: مولانا عبدالملک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالملک اردو نے فریڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اردو میں پیش کیا ہے قیمت ایک روپیہ۔ اقبال کی شاعری: یہ کتاب مولانا عبدالملک کے ذوق قلم کا نمونہ ہے۔ اقبال پر اردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آسکے اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا ادیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنے (چار) عبدالملک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸

نگار ایک ایسی لکھنؤ

نقد پر نقد

جنوری و فروری ۱۹۷۲ء کے نگار میں اکتیس غزل گو شاعروں کا انھیں کا منتخب کردہ کلام شائع ہوا تھا۔ ایک سال بعد جنوری و فروری ۱۹۷۳ء کے نگار میں اُس کلام پر اپنے مختصر نقد و تبصرہ کیا۔ نیاز صاحب نہیں چاہتے کہ یہ نقد ہی میں فرد ہو جائے بلکہ نقد لا انتقاد کا باب اضافہ کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ شاعروں کے زمرے میں بدنام ہو چکا، اب نقاد کی حیثیت سے باری ہے ! پہلا مضمون پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا ہے۔ موصوف نے غزل کو ”نیم وحشی صنف ادب“ کا خطاب دیا ہے، وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کی ”صورت“ ناقص ہے ”صورتی حسن“ کا فقدان ہے۔ پروفیسر صاحب غالباً سوچتے انگریزی میں ہیں اور ترجمہ اُردو میں کرتے ہیں، ورنہ اس مطلب کے اظہار کو غزل کے اشعار میں تسلسل خیال نہیں ہوتا، ایک ہی جذبہ یا تجربے کے متعدد پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاتی بلکہ مترخیالات نظم ہوتے ہیں ”صورت“ سے تعبیر نہ کرتے۔ غزل کی صورت کا تعلق اشعار کی ترتیب سے ہے نہ کہ نفس مضمون یا خیال سے لہذا اُس کی صورت کو ناقص کہنا بھل سی بات ہے۔ یا پھر لفظ صورت ”معنی“ کے مقابل استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد شعر کے ظاہری محاسن یا معائب (معنویت سے قطع نظر) ہوتے ہیں، سلاست، روانی وغیرہ یا انھیں کی نفی۔

اُن کی تحریر کا پورا ابتدائی حصہ جس میں تہذیب اور برہیت کا فرق دکھانا چاہا ہے ایسا ہی مبہم اور مغلط ہے۔ اس خامی کا احساس شاید اُن کو بھی تھا کیونکہ لفظ صورت اکثر جگہ و ادین میں لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خود بھی مطمئن نہیں کہ انگریزی لفظ Form کا بر محل ترجمہ ”صورت“ ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ غزل کا صورتی حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا، نیز یہ کہ اگر غزل کے شعر کو مکمل اور مختصر نظم تسلیم کر لیا جائے تو بھی غزل میں صورتی حسن کا فقدان ہو گا اور غزل کی صورت ایسے مجموعہ کی ہوگی جس میں مختلف نظمیں اکٹھا کی گئی ہوں۔ پھر مختلف غزلوں کے منفرد شعرے کو فرمایا ہے کہ اگر غزل میں یہ صورتی حسن موجود ہوتا تو یہ اشعار اس طرح غزل سے الگ نہیں کئے جاسکتے تھے اور اگر انھیں الگ کیا جاتا تو پھر ان کے حسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا۔ یہ منطق میرے سمجھ میں نہ آئی۔ جب غزل کے مفرد اشعار میں حسن ہوتا یا ہو سکتا ہے (یہ مفہوم اُن کے الفاظ ”تو پھر اُن کے حسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا“ میں مضمر ہے) تو یہ کہنا درست نہیں کہ غزل میں حسن کا فقدان ہوتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ غزل کا صورتی حسن دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا، جس کا یہ مطلب ہوا کہ غزل میں صورتی حسن ہوتا تو ہے لیکن جمالیاتی تسکین کے لئے ناکافی ہے، دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ غزل میں صورتی حسن کا عدم ہے ایہ تناقض اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ وہ الفاظ کا مفہوم متعین نہیں کر سکتے، کہنا چاہتے ہیں کچھ اور کہتے ہیں کچھ۔ ایسی متعدد مثالیں اُن کے مضمون میں ملتی ہیں۔ بعض کی طرف آئندہ بھی توجہ دلائی جائے گی۔

اُن کا یہ فرماتا بھی صحیح نہیں کہ غزل کا دائرہ عمل چند خیالات تک محدود ہے۔ اس میں کیا کچھ نہیں کہا گیا اور کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک مبینہ مثال لیجئے :-
پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں ایک جگہ عبارت رقم فرمائی ہے :-

”مہذب آرٹ کی بنیاد فہم و ادراک پر ہے جو قدر و قیمت میں پُر جو خلق تجربات سے بلند تر ہیں، وہ اپنے تجربات الگ تعلق رکھ کر دیکھتا ہے اور ان پر غور و فکر کرتا ہے اور

وقتاً طور پر وہ قارئین کو بھی اپنی بلند سطح پر لے جاتا ہے اور انھیں حیات سے نجات دلا کر غور و فکر سے شناسا کرتا ہے“

اثرستان ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا، اُس میں یہ شعر موجود ہے :-

شاعر کی طرح دور ہی سے کر مشاہدہ
اندوہ مرگ و زلیست میں تو مبتلا نہ ہو

پروفیسر صاحب کے زیر نظر حصہ مضمون کا غالباً یہ منشا ہے کہ غزل میں مجموعی حیثیت سے وہ حسن نہیں ہوتا جو دوسری نظموں یا ڈراموں وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غزل میں مترخیالات ایک خاص ترتیب کے ماتحت (مطلع، قافیہ، ردیف، مقطع) یکجا کر دئے جاتے ہیں، یہ خیالات آپس میں مربوط نہیں ہوتے نہ ان میں کسی تصویر یا جذبہ یا تجربے کی وہ تدریجی تحلیل و تکمیل ہوتی ہے جو مسلسل منظومات میں پائی جاتی ہے، نیز یہ کہ غزل کو یہ بات اُس حالت میں بھی حاصل نہ ہوگی اگر اس کے ہر مفرد شعر کو بجائے خود مکمل نظم فرض لیا جائے۔ یہی الزام نظم پر بھی عائد ہوتا ہے، اس کا بھی ہر شعر یا مصرعہ حسین نہیں ہوتا اور جو حسین ہے وہ نظم سے علیحدہ بھی حسین ہے مثلاً در و زور تیر کی ایک نظم کا یہ شعر :-

FAIR, AS A STAR WHEN ONLY ONE
IS SHINING IN THE SKY.

انگریزی نظموں سے ایسی کتنی ہی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اگر نظم کے پیمانے میں ایسے جاذب توجہ مفرد شعر یا ٹکڑے ہو سکتے ہیں تو غزل میں ان کی موجودگی اور خوبی سے انکار غریب کی اندھی تقلید اور تنگ نظری نہیں تو کیا ہے۔ دیدہ بینا گلاب کے پورے تختے سے بھی کیف ہوتا ہے اور ایک پھول بلکہ پتھر ہی کا مشاہدہ بھی سامانِ عشرت مہیا کرتا ہے۔

طویل نظم ہو کہ شعر واحد، دو یا زیادہ اشعار کا قطعہ ہو، رباعی ہو، یا ہزار شعر کی مثنوی، حسن و قبح کا صحیح اندازہ اور انحصار صرف اس اصول کے ماتحت ہوگا:-

(۱) کیا کہا (۲) کن الفاظ میں کہا (۳) جو کچھ کہا اُس کی قدر و قیمت کیا ہے؟

نمبر ۱ کا تعلق شعر یا نظم کی مجموعی تعمیر و تکمیل اور جزوی ترتیب سے اُس کا مفہوم متعین کرنے اور اُس میں جو اشارے ہیں ان کے سمجھنے سے ہے۔ اس سلسلہ میں نظم الفاظ اور لہجے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ — نمبر ۲ کا تعلق طرز و اسلوب بیان سے ہے جو مفہوم سے نہ صرف مربوط اور مناسب حال ہو بلکہ اُس میں اُچے اور بالکپن بھی ہو۔ اُچے اور بالکپن میں سادگی و پرکاری دونوں شامل ہیں۔ نمبر ۳ کا فیصلہ یوں ہوگا کہ شاعر کے جذبات یا تجربات یا وہ ”آفریدگانِ تخیل“ جنہیں اس طرح محسوس کیا گیا ہے کہ جز و تجربہ بن گئے ہیں کتنے شدید اور کس حد تک شاعر کے انفعالی تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ علاوہ بریں ان میں کہاں تک حسن و صداقت ہے اور اظہار میں باوصف انفرادیت کتنا خلوص ہے۔

اس کے سوا جو کچھ ہے پوچھ بانی ہے، ناقد کی ہو کہ شاعر کی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اچھے مفرد شعر کی خوبیوں پر غور کرنے سے جو ایک غیر ختم جالیاتی لہر اٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے وہ اُس سرت سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے جو کسی پوری نظم کے پڑھنے کے دوران میں یا خاتمہ پر حاصل ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار کا یہی اشاراتی حسن ہے جو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ ایک شعر پڑھئے اور اُس کی رومیں بہتے چلے جائے، کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میں نے تیر کا ایک شعر لیا ہے اور اُس کو رات بھر دہرایا اور میندے سے زیادہ خوشیاں پایا ہے۔ نظم میں طویل ہو یا مختصر۔ جادو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کو ختم کرنے کی خواہش فطری ہے۔ بیچ بیچ میں بعض اجزا ٹکھرنے کی دعوت دیتے ہیں، آپ اُن کا پیش کردہ جرعہ چڑھا کر آگے بڑھتے ہیں نظم ختم کرنے پر (اگر صناعتی کا عمدہ نمونہ ہے) آپ ایک پرسکون لذت یا لطیف بے چینی محسوس کرتے ہیں اور بس۔ نظم وہ شدید محویت اور والہانہ سرخوشی مہیا نہیں کر سکتی جو غزل کے کسی عمدہ شعر کا جو سر ہے جس میں کشش، تڑپ، لذت، حسن اور نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے۔

غزل کے اشعار میں تنوع ہونے سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر پڑھنے والے کے لئے اُس کے مذاق یا افتاد طبع کے مطابق یا ایک ہی شخص کے مختلف اوقات میں بدلتے ہوئے کیفیات مزاج کے لئے سامانِ دلچسپی موجود ہونے کا امکان ہے۔ نظم کا تسلسل ایسا گونا گوں سامانِ تسکین و تفریح فراہم کرنے سے عاجز ہے۔ علاوہ بریں غزل سے حسبِ حال شعر کا انتخاب اتنا مشکل نہیں جتنا حسبِ حال نظم کا انتخاب مشکل ہے۔

کامیاب سے کامیاب نظم از اول تا آخر مرصع نہیں ہوتی بلکہ جو اہر پارے ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں، تاہم یہی آنکھ مارتے ہوئے تارے پوری نظم کی جان ہوتے ہیں، یہی یاد رہ جاتے ہیں اور پوری نظم کو مشہور اور لافانی بنادیتے ہیں۔ غزل کے دامن میں بھی ایسے نعل دگو ہر ملتے ہیں، بیشتر اشعار غزلوں ہی کے ہیں جو ضرب الامثال بلکہ جز و زبان ہو گئے ہیں اور اس کی وسعت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ایسی مفید اور دلکش اور مقبول صنفِ کلام کو ترک کرنے کا مشورہ دوستی کے پردے میں دشمنی ہے، اسی طرح غزل کو مسخ کر کے نظم کی گٹری شکل بنا دینا بھی دانشمندی سے دور ہے۔ یہ ضرور ہے کہ متغزلین ”دست و پیل و دامن گل“ کی طرح اُگتے چلے آتے ہیں اور صبحِ غزل ”نمونہ یوم الحساب“ بن گیا ہے۔ اس کثرت سے گھبرانا چاہئے، زمانہ ہر شاعر کی عمر شعری مقرر کرنا خوب جانتا ہے۔ کچھ باقی رہ جائیں گے، باقی بھلا دئے جائیں گے۔ اس بقا کی بھی ایک مدت معین ہوگی۔

اب غزل اور نظم کی مجموعی ہیئت پر غور کیجئے۔ اگر نظم کا حسن ایک لڑی میں متعدد موتی پرونا ہے تو غزل کا حسن ایسا زیور طیار کرنا ہے جس میں مختلف رنگوں کے جو اہر پڑے ہونے کے باوصف گلوں اور اُن کے رنگوں اور تراش و خراش میں ایسا توازن اور تال میل ہو کہ ہر نگ الگ الگ بھی حسن دے اور اُن کا باہمی خوشگوار امتزاج نیز اُس زینہ کی ساخت صنعت کا ایک شاہکار پیش کرے۔ اسے غزل کے اشعار کی ہم آہنگی کہتے ہیں۔ اختلاف میں اتحاد اور اتحاد میں اختلاف جو ارتقا یا تکمیل صنعت کی آخری نہ سہی بلند منزل ہے۔

پروفیسر صاحب نے غزل کو نظم کے معیار سے جانچا، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنی ترکستان پہونچ گئے!

غزل کو ناقص کہنے والے تاریخ اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بحث کرتے ہیں۔ مغرب کا شاعر اعظم گئے حافظ سے اتنا متاثر تھا کہ اُسی طرز کا ”دیوان“ مرتب کیا۔ جذبات نگاری کے لئے غزل سے بہتر کوئی صنف نہیں، یورپ میں فرانسیسی شاعری اس بنا پر قبیح ہے کہ جذباتی شاعری ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ قدیم یونان کی شاعرہ سیمفون کے کلام میں جذبات کی جو بھر پور آگ ہے اُس کی نظیر بعض فارسی اور فرانسیسی شعرا کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں فارسی کی غزلیں تھیں نہ کہ اور کوئی صنفِ سخن۔

اور تو اور اردو کے مایہ ناز غزل گو شاعر غالب کا یہ شعر اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ غزل سے بیزار تھا!

بقدر شرق نہیں طرف منلناے غزل

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

حالانکہ شعر کی شان نزول یہ ہے کہ غالب غزل کہتے کہتے تجمل حسین خاں کی مدح پر تھک پڑے، مدح کے لئے قصیدہ مختص ہے، غزل میں اس کی گنجائش نہیں لہذا معذرت کے طور پر مندرجہ بالا شعر تہید میں پیش کیا، اس غزل پر ایک سرسری نظر ڈالئے اور ”غلطیہائے مضامین مت پوچھ“ کہہ کر خاموش ہو جائیے:

دیا ہے خلق کو بھی تائے نظر نہ لگے

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پر بارخسدا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیر دولت و دیں اور معین ملت ملک

بنا ہے چرخ بریں جس کے آستان کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محو آرائش

بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یاران نکتہ دال کے لئے

یہ غزل اور قصیدہ کا غلط بحث تھا جس کے لئے پہلے معذرت کی گئی اور پھر تفاخرانہ انداز میں اپنے فعل کو سراہا بھی گیا۔

یہ بھی غلط ہے کہ فارسی اور اردو کے سوا غزل کا کسی زبان میں وجود نہیں۔ میں نے انگریزی کے ذریعہ سے ترکی غزلوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جدید انگریزی شاعروں نے غزل کے عنوان کے ماتحت طبع آزمائی کی ہے۔ گجراتی زبان میں غزلیں جب چاہے ریڈیو پر سن لیجئے۔ ہندی زبان پر بھی اس کا جادو چل چکا ہے۔ مگر ہمارے مغرب زدہ ادیب غزل کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ جہاں تک صنف کلام کا تعلق ہے غزل پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا اور اس کو ”صوری حسن“ سے محروم کہنا (صوری حسن سے فاضل پروفیسر کا جو کچھ بھی مطلب ہو) ایک بے معنی سی بات ہے۔ مضامین کی نوعیت، اُن کی بلندی یا پستی، اسلوب و ادب میں سلیقہ یا بے عنوانی ان کی نسبت جو چاہے کہئے۔

کسی نے بڑے پتے کی بات کہی کہ غزل سب سے آسان اور اُسی کے ساتھ سب سے دشوار صنف کلام ہے۔ ردیف اور قافیے کے سہارے اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے کہیں پہنچ جاتا، دلدل ہی کیوں نہ ہو) آسان ہے، مگر جس کے پہلو میں دل ہے اور اُس کی روشنی میں کائنات اور حقایق حیات پر غور، نیز اپنے اور دوسروں کے نفسیات اور گرد و پیش کی اشیا کا مطالعہ کیا ہے وہ ردیف و قافیہ یا تنہا قافیہ کی پابندی صرف اس لئے کرتا ہے کہ خیال کے دوسرے محرکات جو زیر نظر ردیف و قافیہ سے وابستہ نہیں ہیں اُتنی دیر کے لئے معطل ہو جائیں اور خیال کا ایک (وقتی) مرکز ثقل قائم ہو جائے۔ اگر خیال میں دم اور جولانی نہیں تو شعر ردیف اور قافیہ کی ”ٹکر لگائی“ سے آگے نہ بڑھ سکتا۔ ایسا شعر انھیں کو پسند بھی آئے گا جن کے شعوری تجربے میں گہرائی نہیں۔ مثال کے طور پر مودودِ غفران، جوشاعر اسے ہوس پرستی یا جنسی تحریک سے الگ نہیں سمجھتا اُس کے اشعار میں ایسے ہی واقعات کی عریاں مصوری ہوگی اور اُس کے ہنسیال ایسے اشعار پر سر دھنیں گے، مگر جس نے عشق کیا ہے اور عشق پر غور کیا ہے وہ عشق کو (قطع نظر اس سے کہ حقیقی ہو یا مجازی) یہ تفریق ہی لغو ہے) آلودگی سے ہمیشہ پاک رکھے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شاعری محض نقالی یا بیانِ واقعہ نہیں بلکہ بحیثیت ”فن لطیف“ اس کا منصب اولین ترجیحی اور بلند نظری کے علاوہ زندگی کے مشاہدات اور اہم عناصر کو سطحی قدروں سے علیحدہ اور تمیز کرنا بھی ہے۔ ایسا عاشق یا شاعر باوصف و مقدور حصول مقصود سے دستکش رہتا ہے۔ معشوق کو ”رضائی“ میں گھس آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ واردات عشق کا صناعتانہ تجزیہ کرتا ہے اور تصویر کے وہ نقوش جو محض مادی خواہشات کے مظاہر ہیں خارج کر دیتا یا دھندلے چھوڑ دیتا ہے۔ تیر کا یہ شعر لیجئے:۔

ساحلِ سمیں دونوں اُسکے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دئے

بھولے اُسکے قول و قسم پر، ہائے خیال خام کیا

یہی عاشقی ہے اور یہی شاعری ہے۔

تیر ہی دوسرا معیار قائم کرتا ہے:۔

اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر ہے

دونوں طرف سے دیدہ و آئی نہیں ہو خوب

تیر پر موقوف نہیں اور شاعر بھی اس راز کے محرم گزرے ہیں

دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ

نظام (راپوری) کا سلیقہ نہ ہو تو یہی شعر قبزل ہو جائے۔ دلکشی کا راز انگریزی کی اداسی نہیں بلکہ معشوق کی حیا پروری میں ہے کہ ایک اضطراری کیفیت یعنی انگریزی کو ایک محرم کے سامنے بھی ٹال دیتا ہے لیکن مخا خیال آتا ہے کہ اس ٹالنے میں عشق کی سچائی اور صدا کیشی پر عدم اعتماد کا پہلو نکلتا ہے جس میں عاشق کی خاطر شکنی مضمر ہے۔ لہذا تبسم سے تلافی کر دی جاتی ہے۔ ایسی دسی ہزار نظمیں اس ایک شعر پر قربان ہیں۔ اس کے بعد یہ شعر نقل کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر مطلب واضح کرنے کو تعادل ناگزیر ہے۔ گواہ بانی آتی ہے اور 'جول پڑھنا پڑتی ہے'۔

دکھائی لے کے انگریزی مجھے زنجیر سونے کی
اشارہ تھا کہ منید آئی، کرو تیر سونے کی!
اب اسی پر کوئی ہاتھ لے اور زانو پیٹے تو اسے اختیار ہے۔ غائب کا یہ شعر لیجئے:-
منید اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
یہ منید اس کی ہے، کاٹکڑا ہے جس نے شعر کو صنایع کا قابل رشک نمونہ بنا دیا۔ حالانکہ ہوس کا موکل کہیگا کہ ایسے موقع پر منید کہاں!
اسی کے ساتھ غائب ہی کا یہ شعر پڑھئے اور صلواتیں سنائیے!
پنیں میں گزرتے ہیں جو وہ میری گئی سے
کنڈھا بھی کہا رول کو بدلتے نہیں دیتے
تکدور کرنے کو تیر کا ایک شعر اور سن لیجئے:-

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لگت سے آبلہ جا کے اُسے بات :- آنی
طلب بوسہ، ہوس و لذت بوسہ سے بے نیاز ہو کر "لگت سے اُلجھنے" اور "بات نہ آنی" کی آن کے مزے لٹتی ہے۔ یہی عشق اور ہوس میں فرق ہے۔
جس شخص نے شاعری کی اس فضا میں سانس لی ہے، فطرت اور نفسیات کا مطالعہ جس کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے اور جسمتی سے خود بھی شعر کہتا ہے، اس کے لئے عجیب
مشکل کا سامنا ہے۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے:-

کہوں تو کیا کہوں، کس سے کہوں، کہنے سے کیا حاصل
خوشی پر مری بے درد جو چاہے کہاں کر لیں
مگر یہ "ناز فرمائی" نیاز چین لینے دے!

مجھے امید تھی کہ غزل کو مردود قرار دینے کے بعد پروفیسر صاحب نظم گو شعرا کا حوصلہ بڑھائیں گے، مگر نہیں، سنئے!
"نظمیں تو اردو میں بہت ملتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی نظم صحیح معنوں میں نظم کہی جاسکتی ہے"

اس تمہید کے بعد وہ بزم شکار میں شریک ہونے والے شاعروں کو پانچ جھوٹے یا گروپ میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے گروپ میں وہ شاعر ہیں جو زندہ تر نظمیں کہتے ہیں۔ انکی تفصیل یہ ہے:- (۱) احسان دانش - (۲) علی اختر اختر - (۳) اختر شیرانی - (۴) جوش ملیح آبادی - (۵) حفیظ جالندھری - (۶) ملک چند محرم - (۷) افسر میرٹھی - (۸) اشرف شاہ - (۹) روش صدیقی۔ ان میں سے تین کی بابت فرمایا ہے کہ بھول کر بھی غزل کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہئے تھا، یہ محرم، جوش اور احسان دانش ہیں۔ محرم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ آواز بلند اور کسی حد تک کڑوت ہے، نرمی اور نوپ کی نمایاں کمی ہے، شیرینی کا نام و نشان بھی نہیں، شاعر نہیں، نظمیں ہیں، ثبوت میں یہ شعر پیش کئے ہیں:-

اے ہیراں دشت محبت بڑھے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا
اے دل یہ کیا فسر دگی آغاز عشق میں
گل کیوں ترا چراغ سرشام ہو گیا
ہو دور غم کہ عہد خوشی دونوں ایک ہیں
دونوں گزشتہ تھی ہیں، خزاں کیا بہار کیا
سمجھ میں آیا نہ راز صفت ذرا بھی صورت گرازل کا
بنار ہا ہے مشام کا، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

فرماتے ہیں کہ پہلے شعر میں ہیراں دشت محبت سے مخاطبت ہے تو دوسرے شعر میں اپنے دل سے مخاطب ہے۔ بقیہ دو شعر میں بظاہر کسی سے مخاطبت نہیں لیکن لیجئے کیا ہے کہ شاعر خلوت خیال میں دل کا ترجمان نہیں بلکہ کسی بزم میں خطیبانہ انداز میں مائل گفتگو ہے۔ سمجھے آپ شاعری میں مخاطبت کا مفہوم؟ یہ منطقی استدلال، بلند آہنگ لفظی خشک بند و موعظت نہیں ہے بلکہ جہاں حزن نہ آتا شاعر خطیب بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ حرفت و نابغہ بھی مخاطبت نظر آتی ہے۔ واضح ہو کہ لفظ مخاطبت استعمال ہوا ہے نہ کہ خطابت

جس سے غیر شاعرانہ انداز بیان اور لہجہ کی طرف اشارہ ہو۔ آئیے پہلے شعر کو اس اصول پر جانچیں جو میں نے عرض کیا ہے :-

۱۔ کیا کہا - ۲۔ کن الفاظ میں کہا - ۳۔ جو کچھ کہا اُس کی قدر و قیمت کیا ہے۔

- ۱۔ ایک شخص برائے اسیری یاد گیر قیود و موافق منزل کی طرف گزرنے سے باز رہتا ہے، وہ اس حالت میں اپنے ہمراہیوں کو آواز دیتا ہے کہ تم نہ ٹھہرو بلکہ بڑھے جلو۔
- ۲۔ خیال پورے جوش اور قوت سے نظم ہوا ہے، منزل کے شوق کی طرف ”پائے شوق“ کا اشارہ لطیف اور بلیغ ہے۔ ”بڑھے جلو“ سے ہمراہیوں کے توقف اور اس شخص کی مرد کو طیار ہونے کا جہی پتہ چلتا ہے، اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے سبب سے دوسروں کی منزل کھوٹی کرنا نہیں چاہتا۔
- ۳۔ شعر میں حسن کے ساتھ صداقت ہے۔ ہمت اور کوشش جانا معمولی بات تھی مگر شاعر ایک ایسی صورت پیش کرتا ہے جہاں انفرادی شخصیت جمہوریت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ پھر وہ انہیں اگر شخص محروم رہا، ہمراہی سرگرم طلب رہیں اور منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ ایسے شخص کا غیور اور ”امنسا“ پر عامل ہونا لازم ہے، کردار کا یہ پہلو بخوبی روشن ہے۔ اُس کردار کی شرافت اور جلو پر غور کیجئے جو ہمراہیوں سے حالت ابتلا میں مرد کا خواستگار ہوا تو کیسا متوقع بھی نہ ہو بلکہ تاکید کرے کہ بڑھے جلو، مجھ پر جو گزرتی ہے گزرنے دو۔
- میں نے ایک نمونہ پیش کر دیا، آئندہ مطالب کی وضاحت نہ کروں گا ورنہ مضمون کچھ جتن نہ ہوگا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ محروم کے کلام میں ایک صاحب بصیرت کی حقیقت نگاری تو بے گمروہ عناصر کم ہیں جو غزل کو رنگین بناتے اور مزاج بھرتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا :-

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگر پہ خواب
جو کچھ ہے خواب ہے دل بیدار کے لئے

دش کے متعلق پر فیصلہ صاحب کی رائے ہے کہ یہ کرباب کی طرح غزل میں نئی وسعت پیدا کرنے کی کوششیں ہیں، اس طرح ایک حد تک تاریخی اہمیت ہے لیکن غزل میں کوئی خاص پایہ نہیں۔ بلند آہنگی کے ساتھ ترکیبیں اور بندشیں رعب دار ہوتی ہیں جن سے غزل کے بڑے قصیدہ کی فضا پر راہ ہوجاتی ہے۔

جوش کا شاعرانہ اقتدار مسلم، وہ اُن معرودے چند شاعروں میں ہیں جو تحفہ کی بلند ترین پر دان کے باوصف اپنے اشعار کو مفاہق اور ہم نہیں ہونے دیتے اور زبان کے انسوفی حدود سے انحراف نہیں کرتے، قدرت کی طرف سے انھیں یہ سلیقہ بھی ودیعت ہوا ہے کہ خیال اور اظہار خیال کے اسالیب میں توازن کے ساتھ رنگینی، رعنائی اور دلکشی بخیریں۔ کتب کی تحفہ میں ”ازگی اور قدرت بھی ہوتی ہے، زندگی کا دھڑ بھڑ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر جب سے شاعر کو اور ایڈیٹر شکر اور مصنف بننے کا شوق چڑھتا ہے جس کے تحت اشعار اُن کی ”مفروضہ“ تمناؤں اور خواہشوں کی ناکامی کا احساس کا فرما ہے، اور جس نے انھیں ایسا بچہ بنا دیا ہے جس نے مادے خراب کیا ہو اُن کی شاعری میں عذرت کی بدلتی، درشتی اور خشونت نے لے لی ہے۔ اُن کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی، تھوڑے ہی عرصہ میں دھوم مچ گئی نظم کی طرف متوجہ ہوئے، وہاں بھی کوس من الملک بکایا۔ کس قدر قابل عبرت ہے یہ امر کہ اب وہی جوش ”اہر من زار الحاد“ میں ڈانٹنے کی ”ڈیوائن کامیڈی“ کے ”نیراڈ“ کی طرح خلق سے آوازیں نکال رہے ہیں! اگر ماضی کی طرح مستقبل بھی ”معنی آتش نفس“ کے سر پر بکا کا تاج رکھے گا تو اُن کی ایسی شاعری دیر پا نہیں معلوم ہوتی۔ یہ نغمہ نہیں ایک چیخ ہے اور چیخ بھی ایسی جو دکھے دل سے نہ نکلی ہو۔ بلکہ جیسے کسی عنبریت کے اچانک سوئی چھوڑ دیا جائے۔ افسوس اُردو ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گئی جس میں حافظ شیراز کے امکانات تھے۔ جو شخص اس پایہ کے شعر کہہ کر آہوا کر غزل سے ہٹا دے ہو جاتا تو نہ معلوم کہاں ہوتا :-

میں آہ نہ بھرتا تو ترا لعل نگاریں
گل بیز و گل افشاں دگر بار نہ ہوتا
کچھ روز تک تو ناتوازش فرزا گئی رہی
آخر جہوم عقل نے دیوانہ کر دیا
فراغ روز مسرت کے ڈھونڈنے والے
شبوں کو محرم سوز و گداز کرتا جا
آیا ہے جوش تحفہ داغ جگر لے
مرضی تری، پسند نہ کر یا پسند کر
اتنا انوس ہوں فطرت سے اگلی جب چٹکی
جھک کے میں نے کہا، ”مجھے کچھ ارشاد کیا؟“
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
مٹ چلی تھی فلش سجدہ شوق
پھر ترا نقش قدم یاد آیا

پروفیسر صاحب احسان دانش کے پاس میں کہتے ہیں کہ غزلیں کہہ کر غزل پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ نظم گو ہیں اور غزل کہتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اگر اس طرف توجہ رہی تو نظم کی طرح غزل میں کامیاب ثابت ہوں گے۔ جس شخص میں ایسے شعر کہنے کی صلاحیت ہو اُس سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔

میں اُس کی شانِ کرم کے صدقے، دیا ہوا آسان چھلک لیا
 نہ جانے محبت کا انتخاب کیا ہے
 ہمارے رضا جوئیوں کو دعا دے
 عشق کو تقسید سے آزاد کر
 بھٹکا ہوں اپنی منزل مقصد سے بارہا
 نمودنوں کی فغانِ پیہم، سکون کی آہیں نظر کے نامے
 میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں
 ترے ناز کو بے نیازی سکھادی
 دل سے گریہ، آنکھ سے فریاد کر
 آسان جان کر، کبھی دشوار دیکھ کر

علی اختر، اختر شیرانی، روش صدیقی اور افسر میرٹھی کے کلام میں پروفیسر صاحب کو ایک قسم کی تازگی، جوانی کی اُمنگ، زبان میں سلی اور نرمی ملتی ہے، بیکن افسر کے سوا
 کسی کا ایک مخصوص رنگ نہیں۔ اختر شیرانی کی بعض نظمیں مجھے بہت پسند ہیں۔ اُن کے کلام میں جوش اور تازگی کے ساتھ ایک خلوص ایسا ہے جو بہت سی بے عنوانیوں کو گوارا بنا رہا
 ہے۔ اکثر شہرہ آفاق شاعر ہی شگفتگی ایک مایوس و حیران نصیب کا اپنی بربادیوں پر تہقیر ہے جو فریاد سے کہیں زیادہ دلخراش ہے۔
 ہوئے ناکام، ہوس کا رہنے کیوں اختر
 یادِ سلی میں جوانی کو گنوار دینا تھا
 خوابِ نوشین میں ہے وہ جانِ بہار
 نور و نکہت کی داستانِ نموش
 اس اداسے کون یہ جلوہ گر سر بزمِ حسن خیال ہے
 جو نفس ہے مست بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے

علی اختر کے خیالات کو بھی پروفیسر صاحب نے نو فزا درخام کہا ہے حالانکہ اُن کے کلام میں کافی گہرائی ہے :-

دل کے اکثر فسانہ - جمیل
 توڑ دے دل میں کوئی تیز سا قشرِ مطرب
 آنسوؤں میں سناے جاتے ہیں
 مسکرائے وہ، مجھے یاد آگیا پیمانِ ضبط
 روحِ خوابیدہ ہے، نعموں کا یہ ہنگام نہیں
 رہ گئی شرمائے گستاخی لبِ فریاد کی
 جو تیرے تصور سے آباد ہے
 حیرانیاں، لطافتِ عرفان لے ہوئے
 ہم سے اس فصل میں تو یہ ہوگی؟!
 تم گئے آنسو، مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے
 دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

روش صدیقی کی غزل کو بھی پروفیسر صاحب بے غلی اور بے اثر کہتے ہیں حالانکہ نظم کی طرح اُن کی غزل بھی ایک خود دار اور پُر صفا شخصیت کی آئینہ دار ہے جس کی فتادگی
 اور شکست میں بھی اک شان ہے :-

یا قننا سے محبت محال سمجھو نگا
 خموشی سے بھی بار تر جانی اُٹھ نہیں سکتا
 اگر یہ سچ ہے کہ ملنا تر محال نہیں
 بہت غمناک رو دادِ محبت ہوتی جاتی ہے
 احساسِ محبت بھی مٹنا نظر آتا ہے
 گریہ نیم شبی ہے نہ دعا سے سحری

افسر میرٹھی کے ساتھ بھی پروفیسر صاحب نے انصاف نہیں کیا۔ افسر تیرے متاثر ہیں اور اپنے اشعار میں وہی سادگی پیدا کرنے اور تاثیر بھرنے کی کوشش کرتے
 ہیں، ان کے کلام میں جدید اثرات بھی پائے جاتے ہیں :-

وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
 مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط
 ترے جلوؤں کی دامنِ نظر میں بھیک ہوتی ہے
 دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے
 ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
 کاروانِ بہار دیکھا ہے

تاروں کا گوشمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
مجھے فردا کی فکر کیونکر ہو
غمِ امروز کھائے جاتا ہے

پروفیسر صاحب کی نظر میں حقیقتاً جالندھری کے خیالات متبذل اور پیش پا افتادہ ہیں جن میں کوئی حُسن، جدت یا انوکھا پن نہیں، حالانکہ اُن کے اشعار میں پختگی کے ساتھ تازگی ہے اور اُن شاعروں میں ہیں جو ”راز درون خانہ“ پر دہائے می وینا میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں:-

ہر قدم جس کو نئی چال :- چلنی آئے
وہ تو ہرگز بھی نہیں، راہنما کیا ہوگا
خلاق تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے
بے تعلق زندگی اچھی نہیں
زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار
یہ جس کے پاس نہ ہو، صبر اختیار کرے
ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے
تمہیں بھلا دیا، ہم تمہیں بھلا سکے
آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

اندنراین ملا کی نسبت فرماتے ہیں کہ ابتذال و فرسودگی سے پرہیز ہے لیکن جدت و باریکی کا نام و نشان نہیں۔ وہ عجیب ”معلق“ کلام ہو گا جس میں یہ بھی نہ ہو اور وہ بھی نہ ہو۔ پروفیسر صاحب نے ملا کو نصیحت فرمائی ہے کہ محض خیال بندی سے کام نہ لیں اور اپنے ذاتی کوائف کی تصویر کشی کریں تو اُن کے شعروں میں جان آجائے۔ میرا مطالعہ کہتا ہے کہ ملا کے پہلو میں ایک درد مند دل ہے اور وہی کہتے ہیں جو کچھ حقیقت و صداقت سمجھتے ہیں۔ ملا کے یہاں انفرادی شائق پائی تو پروفیسر صاحب نے حکم لگا دیا کہ شعوری طور پر پیدا کی گئی ہے، فطری نہیں! ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تجربات ذاتی نہیں تھے تو انھیں حاصل کرتے، تحریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ ملا کے کلام میں جن تجربات کا بیان ہے وہ نہ تو ذاتی ہیں نہ اکتسابی ہیں، یعنی تجربات ہیں مگر نہیں ہیں!۔ ستم ہے کہ ملا کے یہ عمل پارے حقارت سے ٹھکرا دئے جائیں!

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزر رہا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

ملا کی شاعری اُن کی حیات سے بالکل مطابق اور اُن کی بلند نظری کا آئینہ ہے، اس میں جوانی کی ہمت اور بہت کی جوانی ہے۔ موجودہ معاشی، اقتصادی اور سیاسی نظام سے بے اطمینانی کی بھی جھلک ہے۔

ہر شور و شرس حیات سے بدظن بنا دیا
دنیا کو اہل امن نے مدفن بنا دیا
ہر وہ ہے خاک کے دسے جو کدے زر نگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نوہر سنانے کیا
عرش بریں پہ چمکا، آج اور اک ستارہ
کس نے قلوب دل سے سر رکھ دیا زمین پر
پیہم رہ طلب میں مشکل کا سامنا ہے
ہر کام پر فریب منزل کا سامنا ہے
بنے دشمن کو اپنے، پھر ہم بھی کریں گے سیر چین
جب تک کہ نشیمن اجڑے، پھولوں کا نظار کون کرے
اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کے کٹ سکی نہ رات کبھی

دوسرے گروپ میں پروفیسر صاحب نے یہ شاعر رکھے ہیں:- (۱) کیفی، (۲) ناطق گلاؤٹھی، (۳) امید میٹھوی، (۴) دل شاہجہاں پوری (۵) آستی، (۶) تاجور۔

(۷) جتو، (۸) سائر، (۹) سیما، (۱۰) وحشت، (۱۱) یگانہ۔ فرمایا ہے کہ یہ کامیابی سے قافیہ پیمائی کر سکتے ہیں مگر ان میں یہ جوہر نہیں کہ غالب و ذوق و مومن کی طرح اپنی اپنی مخصوص جگہیں ایوانِ تغزل میں بنالیں مگر بیانِ خشک، سادہ، بے رنگ۔ کسی انفرادی مطالعہ کا ثبوت نہیں دیتے۔ امید دراصل فارسی کے شاعر ہیں، اردو میں محض بیابانِ خاطر احباب کبھی کبھی موزوں کرتے ہیں، فارسی تراکیب کے دلدادہ ہیں۔ میں نے خود اُن سے اکثر اشعار ایسے سنے ہیں جو اُن کے انتخاب سے بہتر تھے، پھر بھی انتخاب کے بعض اشعار میں تاثیر اور مزہ ہے، مثلاً:-

کل تا جو پوچھا تو اک بات بھی تھی ظالم
(بکس کو پوچھتا ہے، امید اب کہاں ہے)

سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا
 دل کی الجھن نہ پوچھئے اُمید
 کچھ اب کے عجب حسرت دیدار ہے ورنہ
 کیا گل نہیں دیکھے کہ گلستان نہیں دکھا
 سحر کے متعلق کہنا کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں زیادتی ہے۔ انھوں نے تصوف کو اپنا لیا ہے اور اس رنگ میں خوب خوب شعر کہے ہیں۔ انکی زندگی ہی ایک صوفی کی پاک بے لوث
 زندگی ہے۔ خود رنگی سے منزل حیرت میں ہے مقام
 آئینہ خانہ ہے درو دیوار آج کل
 اسی پایہ کے اور شعر بھی ہیں، بخون طوالت نقل نہیں کئے جاتے۔

پروفیسر صاحب نے امیر اور سحر سے کچھ زیادہ کامیاب کہتی، ناطق گلاؤٹھی، دل شاہجہاں پوری، آتشی الدنی اور تجوید دہوی کو کہا ہے۔ مگر پھر کچھ نہیں، یہ
 عجیب و غریب تنقید ہے! ان سب شاعروں کے انتخاب میں ایک معقول تعداد اچھے شعروں کی ہے جن سے اہل ذوق لذت اندوز ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب بھول جاتے ہیں کہ
 ان سب حضرات کے ذہن میں غزل کا ایک خاص تصور تھا اور اُسی کے تابع غزل کہی۔ مضامین میں متنوع سہی انداز بیان میں تازگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اکثر اشعار میں حقایق
 اس طرح نظم ہوئے ہیں کہ نئے معلوم ہوتے ہیں۔ وحشت اور یگانہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔ وحشت میں غالب کی تمام خوبیاں جمع ہو گئی ہیں جن پر ان کی طبیعت نے
 اضافہ بھی کیا ہے اور اُس رنگ کو نکھارا ہے، محض دلکش ترکیبیں ہی نہیں مضامین بھی بلند ہیں اور طرز ادا میں بدت و سنگینی دے ساختگی ہے۔

ہوئی جو چشم ہوس کامیاب نظارہ
 بہار گمشدہ امید کا مال نہ پوچھ
 معاذ اللہ اتنی نامرادی
 کرم ہے یہ بھی ترے شوق خود نمائی کا
 وہ خواب رونق گلدستہ خیال ہوا
 کہے گی وہ نگاہ آشنا کیا
 محال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی
 خیال ترک محبت تو بار بار آیا
 اگر وحشت غالب کی یاد تازہ کرتے ہیں تو یاد تازہ کرتے ہیں تو یگانہ میں آتش کا دالہا نہ انداز، استغنا اور تیکھا پن ہے۔
 خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
 وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
 ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
 عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
 خوشا نصیب جسے فیض عشق شور انگیز
 بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوانہ ملا
 گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہوگی آس
 پھر کیا بڑھے گادل رسن و دار دیکھ کر
 نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل چھو گیا
 مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامال نظر ہو کر

یگانہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے عامیانہ بول چال اور محاوروں کو لکھنو کی ٹکسالی زبان سمجھ لیا ہے، ان کی جدید غزلوں میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے
 اس گروپ کے شاعروں میں پروفیسر صاحب نے سیماب کو رنگ بندوں میں غنیمت سمجھا ہے۔ خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں (یعنی سیماب نے جدید غزل
 کی داغ بیل ڈالی) وہ شعر پیش کئے ہیں جن کی فرسودہ خیالی آپ اپنی ماتنگسار ہے۔

دینا تجھے فریب نوید حیات تم
 جب لوگ جارہے ہوں جنازہ لئے ہوئے
 تو اپنی بزم ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ
 آیا کہاں سے تیری تمنائے ہوئے
 ("عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے")

اس فالکدان عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ
 ذرے پڑے ہیں وسعت صحرائے ہوئے
 دغیرہ وغیرہ۔ ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں لطافت یا تازگی ہو۔ یہ شعر دعوت فکر دیتا ہے مگر مطلب سمجھ میں نہیں آتا ہے
 تھی کثرت جمال سے تاریک بزم دہر
 آنا پڑا چراغ تمنائے ہوئے
 کثرت جمال سے بزم دہر کا تاریک ہونا اور چراغ تمنائے جگمگا اٹھنا میرے ذہن کی رسائی سے بالا ہے۔ میں نے عجیب بات یہ دیکھی کہ پروفیسر صاحب کہتے ہیں شعر

پند نہیں آتے اور پست و متبذل اشعار اُن کے دامن دل کو کھینچتے ہیں۔ اب میں کچھ شعر سیما صاحب کے انتخاب سے پیش کرتا ہوں جو دراصل تحسین کے مستحق ہیں:-

اے غم عشق ترے فتن میں کچھ آگ بھی ہے
ایوان تصور سے اپنے نکلاہ طلب کی دنیا میں
آنسوؤں سے تو علاج تپش دل نہ ہوا
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا
تو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جان پر
اُس مرکز جمال پر اب ہے مری نگاہ
کہ اپنی حد نظر تک ترپ رہا ہوں میں
جلوسے بھی دیکھ لیں تو طواف نظر کریں
چمکتی ہے جو بجلی، آشیاں معلوم ہوتی ہے

تیسرے گروپ میں یہ شاعر ہیں:- (۱) نوح ناروی، (۲) نایب لکھنوی، (۳) ناطق لکھنوی، (۴) اختر لکھنوی (یعنی راقم الحروف) اور (۵) آزاد انصاری۔ یہ گروپ سب سے گھٹیا ہے کیونکہ معنی آفرینی اور نازک خیالی سے کوئی واسطہ نہیں، ساری توجہ الفاظ سے وابستہ ہے، لفظی اٹل پھیر کو شاعری سمجھتے ہیں۔ معنی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں عین خیالاً پر جوش جذبات، لطیف و باریک وزندہ احساس عنقا میں۔ گروپ نمبر ۲ معانی کا گردیدہ تقا وہ بھی نالایق ثابت ہوا تو اُن بیچاروں کا کیا ذکر جو لفظوں کا گھروندا طیار کرتے ہیں ان میں ناطق اور شاقب مفصل ذکر کے بھی مستحق نہیں وہ نرسے کھرے قافیہ پیمائیں، اختر کے یہاں لطف زبان ہے مگر قدیم رنگ تغزل سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، وہی پرانا ڈکھڑا، نوح ناروی اور آزاد انصاری بھی الفاظ سے کھیلے ہیں اور اسی کھیل کو شاعری سمجھتے ہیں۔ اس گروپ کے شاعر لفظی باز گیر ہیں، لفظوں کی مدد سے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے ہیں جن سے ظاہر میں نظر فریب میں آجاتی ہے اور ان باز گیروں کی چابکدستی سے مرعوب و متحیر ہو جاتی ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھنے سے اس چابکدستی کا بھید کھل جاتا ہے۔

یہ ہے پروفیسر صاحب کی رائے کا خلاصہ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ میں خود ہی کہہ چکا ہوں:-

کیا شخص اثر بھی تھا سمجھانہ کوئی اب تک
عاشق تھا کہ شاعر تھا، دیوانہ کہ دانا تھا

لیکن اس گروپ کے دوسرے شاعروں کو باز گیر کہنا ”بازی، بازی، بازی، بابا ہم بازی!“ کا مصداق ہے۔ اللہ اللہ جو لوگ ایسے شعر کہیں وہ باز گیر کہلائیں! نایب لکھنوی:-

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پتہ تکیہ تھا وہی پتہ ہوا دینے لگے

ہے روشنی نفس میں، ”سوجھتا نہیں
ابر سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

وہ کیا سمجھ سکے گے نشیب و فراز دہر
جو چل رہے ہیں راہ کو ہوار دیکھ کر

کہنے کو مشت پر کی اسیری تو تھی، مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بوتا ہوا

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رب سنا، آواز نہیں آتی

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

محبت ایک مدت سے ہے، یہ معلوم ہوتا ہے
تھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

لہراتی ہے اک بجلی سینے کے حجابوں پر
جنبش میں حرم کا جب پردا نظر آتا ہے

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

چھپ کر ہوا کے جھونکوں میں آتی ہیں جلیاں
ناطق چمن یہ رہنے کے قابل نہیں رہا

وہ نازک وقت آیا آخر کار
کہ ہر رنگ اب طبیعت پر گواہ ہے

دفعۃً اُس کی نگاہ التفات
عشق میں سب سے بڑی افتاد ہے

جواب صاف شکر پا گیا سب کچھ فقیر اُن کا
صدادینے سے مطلب تھا، فقط آواز سُن لینا

بڑھی نہ قہارے کی دعوت حباب سے آگے
مگر دکھا تو نیا اک جھلک سمجھ نہ سکی

آزاد انصاری :-

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلاً خبر تھی
خدا کے واسطے آ، اور اُس سے پہلے آ
منزل کی جستجو سے پہلے کسے خبر تھی
دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر
ماز خود اسی غلط ثابت ہوا
افسوس بے شمار سخنہائے کفنی
آ، مگر اس قدر قریب نہ آ
اگر آزاد سادہ روش نظروں میں نہیں جیتا

یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گمان تھا
کیا کس چارہ تکلیف انتظار کرے
رستوں کے پیچ پھول گے اور نہان ہوگا
دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ
عادت تسلیم ڈالی جائیگی
خون فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے
کہ تماشا محال ہو جائے
توجہ اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

اگر ان شعروں میں نغز اور نازک معنی خود بخود پیدا ہو گئے (لفظی صناعتی کے پروفیسر صاحب خود ہی قائل ہیں) تو ایسی شہیدہ گری اعجاز موسوی سے کم نہیں۔ پروفیسر صاحب قائل نہیں تو نہ ہوں۔ بقول میر :-

نعت رنگارنگ حق سے بہرہ بخت سید کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

چوتھے گروپ میں تین شاعر ہیں (۱) جگر۔ (۲) آزاد۔ (۳) جلیل۔ ان کا شمار علامہ اس لئے کیا ہے کہ کسی حد تک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امتیازی حیثیت کیا ہے؟ پرانی باتوں کو نئے پیرائے میں بیان کرتے ہیں! مگر حافظہ کا یہ حال ہے کہ آگے جل کر جلیل کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ قدیم و جدید تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے، اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگ تغزل کی یادگار ہے۔ آزاد کے یہاں پروفیسر صاحب کو جگر کی رنگینی و جوش و ولولہ جلیل کی تازگی نظر نہیں آتی، درود بھر مضامین پسند ہیں اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے حسرت و فانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مرتبے تک نہیں پہنچتے کیونکہ مضامین میں گیرنگی ہے جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے خیالات کی دنیا نہایت تنگ ہے۔

پروفیسر صاحب کے فرمودات میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ ان شاعروں کا دائرہ تخیل جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں نسبتاً محدود ہے۔ انگریزی سے واقفیت نے شاعری کے لئے (میں غزل کو خارج نہیں کرتا) نئی نئی راہیں کھول دیں، تازہ اسلوب ہتھ آئے، تخیل میں وسعت پیدا کی، مناظر فطرت کے مطالعہ و ترجمانی کی رغبت دلائی اور ان کی مصوری کے شوق کو انگیز کیا، مگر یہاں بھی سلیقے اور صلاحیت کو بہت کچھ دخل ہے در نہ بھونڈے اور بھڑے ترجموں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ حاصل کلام یہ کہ مجموعی حیثیت سے یہ گروپ بھی کسی خاص وقت کا مستحق نہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک خوش فکر ہے اصل یہ ہے کہ موجودہ دور اردو شاعری کا عہد زریں ہے۔ اردو نے کسی زمانے میں ایسے اچھے شاعر اتنی تعداد میں پیدا نہیں کئے۔

اب پانچواں اور آخری گروپ آتا ہے جنہیں پروفیسر صاحب حقیقی معنی میں شاعر سمجھتے ہیں، یہ حسرت، فانی اور فراق ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے غزل کو اپنے محاسن کھو چکی تھی اور محض رسمی اور تقلیدی چیز ہو کر رہ گئی تھی فرسودگی، ابتذال اور تقلید سے نجات دلا کر ”ڈس کر“ نہیں) اصلیت حقیقت اور تاثیر سے مزین کیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو پروفیسر صاحب نے کہیں اور کبھی نہیں کہا کہ اردو غزل کا کوئی ایسا بھی دور تھا جب وہ تقلید کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہیں تھی یا سوائے معائب کے اس میں محاسن بھی تھے۔ میں اپنے استفسار کو نگار کے مضمون تک محدود نہیں کرتا بلکہ اپنے اور کسی مضمون میں دکھا دیں جہاں انھوں نے غزل کا اعتراف کیا ہو۔ ”گل نغمہ“ پر ان کا لکھا ہوا مقدمہ پیش نظر ہے، اُس میں بھی یہ الفاظ ہیں :-

”اردو شعرا عشق مجازی سے نابلد اور عشق حقیقی سے بے خبر تھے، پھر شاعری میں اصلیت آئے کہاں سے۔۔۔ اور ابھی تک اُس کے ابھرنے کا سامان نظر نہیں آتا“

جب غزل کبھی تقلید سے آزاد ہی نہیں تھی، اُس میں کوئی محاسن تھے ہی نہیں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اردو کے نشاۃ ثانیہ کا سہرا ان شعرائے کرام کے سر ہے؟ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ حسرت نے غزل میں ایک انفرادی فضا پیدا کی، اُن کا حسن ظن ہے، خود حسرت نے مصحفی، نوٹن، نسیم، دلہوی، تسلیم اور بے معلوم کن کن شاعروں کے اتباع پر ناز کیا ہے۔ میرا ادعا ہے کہ اردو نے غزل کو شاعروں میں تیرا اور انشا کے علاوہ کوئی صاحب طرز شاعر پیدا ہی نہیں کیا، غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ میر کے بعد جتنے شاعر ہوئے آپ کوئی شعر جو ان کے خاص رنگ کا سمجھے پیش کیجے میں تیرے یہاں وہی انداز بیان نکال دوں گا سوائے انشا

کے جس نے اردو میں ”فنیسی“ یا ہلکے پھلکے دلکش اور رنگین مضامین اور استعاروں کا اضافہ کیا۔ عرصہ ہوا میں نے انشا کی شاعری پر اردو میں ایک مضمون لکھا تھا اور اُس کا ترجمہ انگریزی میں ”ایمرین پاتھ“ بمبئی کے غالباً جولائی ۱۹۶۴ء کے نمبر میں شائع ہوا تھا، جنوری و فروری ۱۹۷۲ء کے نگار میں ”نقاد صاحب نے میرے اس قول کو بغیر کسی حوالے کے بڑی ڈھڈائی اور بے تکلفی سے غصہ کر لیا۔ مجھے پر داند ہوتی اور اس امر کا اظہار بھی نہ کرتا اگر اندیشہ نہ ہوتا کہ ناواقف حضرات اُنٹے مجھی کو چوری کا الزام نہ لگائیں۔ خیر اس قضیہ کو چھوڑئے۔ حسرت کے اچھے اور بہت اچھے شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں مگر یہ کہنا کہ وہ کسی خاص طرز کے موجد ہیں غلط اور یکسر غلط۔ ان کی شاعری پرانے اساتذہ کی آواز باز گشت ہے، فرق صرف لب و لہجہ کا ہے جس کا سبب وہ بعد ہے جو ان میں اور گزرتے ہوؤں کے زمانے میں ہے۔ یہ حسرت یا کسی دوسرے شاعر کی منقصت نہیں۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہے اُس۔ کہ بیان میں اگر صداقت برقی گئی ہے اور وہ صداقت شاعر کے حیات میں رچی ہوئی ہے تو اسلوب ادا میں تازگی اور لذت ضرور ہوگی۔ تازگی اس وجہ سے کہ شاعر کے جذبات نے اُس پر عمل کیا ہے، لذت اس وجہ سے کہ حقیقت اور ایسی حقیقت ہے جو دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر نکلی ہے۔ لیکن اس کی پہچان ذوق سلیم پر منحصر ہے اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں اس نعمت سے بہرہ ہے۔ اس باب میں پروفیسر صاحب کا ہمنوا ہوں کہ اچھے برے اشعار کی تمیز حساس طبیعت اور باریک بین نظر ہی کر سکتی ہے۔ حسن و صداقت کے ساتھ حقیقت کا اظہار آسان کام نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائے شعر گوئی سے آج تک ہر شاعر کے کلام میں جہاں خوبیاں ہوتی ہیں خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ بقول ایک نقاد کے ہوتر بھی کبھی کبھی اونگھ جاتا ہے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے ”خدا صفا دے ماکر“ پر کار بند ہونا چاہئے، تاہم ناقد کے لئے اچھائیوں اور برائیوں دونوں کا احصا لازم ہے، جو عیب نہیں دیکھ سکتا وہ خوبی کی بھی قدر نہیں کر سکتا۔ نذا کو شاعر کی شخصیت سے مرعوب یا تعلقات کی بنا پر طرفدارانہ ہونا چاہئے۔ حسرت کے متبادل اور سو قیاد اشعار کی یہ توجیہ کہ ان کی وسعت مذاق، خلوص نیت اور فراخ دلی کا نتیجہ ہے عذر گناہ بدتر از گناہ کا مراد ہے۔ اگر ایسے غیر شائستہ خیالات اُن کے دل میں نہیں تھے تو شعر کی صورت کیونکر اختیار کی۔ تیر پر قدرت کی تنقید کہ ”بنائش بسیا بلند و پستش بغایت پست“ حسرت کے کلام پر حوت بحوت صادق آتی ہے۔ حسرت کے انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں:-

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزرا نہ کیا
تو نے اسے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

”کام“ کی معنویت پر غور کیجئے اور انگلیاں کاٹئے۔ اس سے تو یہ بازاری شعر کہیں زیادہ مہذب ہے:-

تیری گلی کے سو سو پھیرے
تو تو سوتا بڑا بچہ کچھ ہے
مخمل یار کی رہ جائے آدھی رونق
ناز کو اُس نے اگر انجمن آرا نہ کیا
گو یا ناز کوئی چیز ہے جو تھیلے میں بند الگ رکھی ہوئی ہے۔ ”آدھی رونق“ کا فقرہ امانت کی ”آدھی توقیر“ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔
پیہم مجھے پیالہ سے بر ملا دیا
ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

”بر ملا“ محض مطلع کی خاطر۔ ”پیہم“ صرت ”دریا بہانے“ کی غرض سے۔ بر ملا کی نمائش شعر کو حقیقت سے کوسوں دور کر دیتی ہے، یہ ”دکھا دے“ کا التفات نہ ساقی کے شایان شان ہے۔ میخوار کے لئے باعث نازش ہے۔ یہی خیال تیر کس خوبی سے نظم کر گیا ہے:-

خوشنید سا پیالہ سے بے طلب دیا
پیر مغال سے رات کرامات ہو گئی
بر سر ناز وہ از راہ کرم پہونچا تھا
شب عجب لطف کا سامان ہم پہونچا تھا
مصرع ادلی کی رویت کا جواز ممکن ہی نہیں جب تک از راہ کرم کا لفظی ترجمہ کرم کے راستے ”کیجئے“ کرم کی غرض سے ناز فرامی کرم افنا ز دونوں کی توہین ہے۔
بھی ہیں راہ تمنائیں سیکڑوں نگھیں
کہ ناز جلوہ کرے تیری خوشخامی کا

دوسرے مصرع کی تعقید فریاد کر رہی ہے۔ محاورہ آنکھیں بچپانا ہے یہاں ”نگھیں“ بچپائی جا رہی ہیں اور خدا معلوم سیکڑوں کے اضافہ نے سوائے وزن کی خانہ پرچی کے کیا خوبی پیدا کی۔
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
تیر کے اس شعر
روٹے جو تھے سو ہم سے روٹے ہوئے رہے وہ
کیا روئے ہمیں تو منت بھی کرنے آئی
یا غالب کے اس شعر
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
کے بعد ایسی قافیہ پیمائی کیا ضرور ہے

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
”زہرِ حق“ کا پیش لفظ لکھ دیا گیا! داغ بیچارہ مفت بدنام ہے:-

داغ میں پرچا ہی لوں گا باتوں باتوں میں اُسے
شرط ہے میرا اُس کا سامنا ہونے لگے
پردہ بھی ہے اور پرچانے کی ابتدا بھی داغ ہی کی طرف سے ہوگی یہاں معشوق بام پر آنے ہی نہیں لگا بلکہ بر ملا اظہارِ محبت کرتا ہے۔ یہ شاعری تو ہے نہیں اور جو کچھ ہو:-
گماں نہ ہمیں ہوا ہر زہرِ زہرِ کاری کا
کہ ذکرِ یار میں ہے شغلِ بقیہ راری کا
زاہد کی نظر میں سبک ہونے کا اندیشہ اگر ایک طرف اُس کی بے جا خوشامد ہے تو دوسری طرف رندی و پاکِ مشربی کی تحقیر ہے۔ شعر کو حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔
”مبارک باشد“ والی غزل کافی مطعون ہو چکی ہے اُس پر مزید خام فرسائی بے کار ہے۔

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبرِ حشرت
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں
اندازِ بیان کسی اچھے مفہوم کی رہنمائی کر ہی نہیں سکتا۔

وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے تو جھکوں
سمجھ لیا ہے جو مجبور آرزو مجھ کو
”دیکھا نہ کر“ نظم نہ ہو سکا تو جو چاہا کہہ دیا۔

سب کی خاطر کا ہے خیالِ تمہیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
حقانیت پر محمول کر دیجئے درِ زہر کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ معشوق سے گھاتا مانگا جاتا ہے۔

ماں شوق مجھے پائے وہ بولے ہنسکر
پہلے کس ناز سے رورو کے سنوائے گیسو
فاتح پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ

پہلی ادا ایک بیہواری اور دوسری ایک ڈاکن کی ہے۔ انھیں داستانِ حسن و عشق یا لطائفِ شعر و شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔
بہت نجل ہے ترے درد سے دوامیری
یہ خون ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری

نہ جانے حسرت نے ”دوا“ کہا ہے یا ”دعا“ ”درد“ کے ہوتے دوا ممکن معلوم ہوتا ہے گو معنی کے اعتبار سے دوا کی جگہ قافیہ ”دعا“ چاہئے خبر دوا دیا دعا، یہ بھی ہے
فجالت بھی ہے اور یہ خون بھی ہے کہ خدا نہ سُن لے (یعنی دعا قبول نہ ہو جائے)۔ اسی شعر کا مذاق بلند ہو جاتا اگر خیالِ نظم ہوتا کہ حصولِ مدعا کی دعا کرتا ہوں اور پھر ڈرتا

ہوں کہ دعا قبول نہ ہو جائے
تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری
امانت کے دیوان سے ایک شعرِ کم ہو گیا۔ اس سے انیس ہیں یہ دو شعر ہیں:-

تو کا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں
دعوت میں تیری میں بھی ہوں، معلوم ہو لیکن
کہتے نہ کچھ بنا، وہ قسم کھا کے رہ گئے
کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

ایک کے لئے مرغِ مسلم ایک کے لئے دھوئی ماش کی دال! (یا چھلکوں بھری؟)

حسرت کے انتخاب میں کل ۱۳۶ شعر ہیں، کچھ کی یہ حالت ہے جو آپ نے دیکھی۔ کچھ ایسے ہیں جن میں ابتذال تو نہیں مگر پچھلے بے مزہ، مشکل سے ۲۰-۲۵ ایسے
تکلیں گے جو دل و دماغ کے لئے سامانِ اہتر از مہیا کریں۔ ان کا نمونہ یہ ہے:-

دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُس نے کہ برسوں کوئی
اپنا سا شوق اور دل میں لائیں کہاں سے ہم
لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آزارِ عشق
رات دن رہنے لگی اُس ستمِ ایجاد کی یاد
خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا،
گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمریاں سے ہم
اُس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں
حسرت اب دیکھئے انجامِ ہمارا کیا ہو
جو چاہے آپ کا حسنِ کرم سارِ کرے

نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے
گراں گزرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
اک رنگ التفات بھی اُس بے رخی میں تھا
بجائیں کوششیں ترک محبت کی، مگر حسرت
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش

قیامت ہے نگاہ یار کا حسن خبر داری
نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
اک سادگی بھی اُس نگہ سحر فن میں تھی
جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشم سحر کار آئی
صلح میں شان ہے لڑائی کی

فانی کے انتخاب میں حسرت کے برعکس ابتداء نہیں ہے مگر متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں منطقی استدلال ہے، جن میں محض انفاذ کی طلسم بندی یا مصنوعی آہ و بکا ہے۔ چند

ایسی مثالیں :-

اب تک تری گلی میں یہ رہو ایساں نہ تھیں
اندر سے بے نیازی آداب التفات
ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور نہیں
نہ دل کے ظن کو دیکھو نہ طور کو دیکھو
وہ میری لاش پہ تہمت سی کچھ اٹھا کے چلے
مطلب ہے ضبط عشق سے تاثیر در عشق

اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
دیکھا مجھے تو پائے نظر در میاں نہ تھا
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبال دوش تھا
بلا کی دھن ہے تمہیں بجلیاں گرانے کی
مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے
اخفاءے حال سے غرض افشائے حال ہے

فانی کی شاعری ایک ایسے منکر و فلسفی و عاشق کی شاعری ہے جو غم سے نجات حاصل کرنے کو شراب خواری یا دوسرے قبیح افعال اختیار کرنے کے عوض شاعری میں کھوجانا چاہتا ہے اور اس غرض سے شاعری کو اپنا مشغلہ بناتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے مسائل اور اُس کی تلخیاں بیان کرنے میں اپنی پوری قوت فکر صرف کرتا اور غم میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ جن شعروں میں افتاد طبیعت جلوہ گر ہے لا جواب ہیں، جن میں زندگی اور موت یا دیگر مسائل پر فلسفیانہ تبصرہ ہے وہ کیفیت اور لذت سے خالی ہیں۔ کچھ اچھے شعر سن لیجئے :-

اک معا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
مذاق تلخ پرندی نہ پوچھ اُس دل کا
میری ہوس کو عیش و دو عالم بھی تھا قبول
نکسے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
اُس کو بھولے تو ہوئے ہون آئی
آج تسکین در دل فانی

زندگی کا ہے کوہِ خواب ہے دیوانہ کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزانہ ملا
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا
وہ بھی چاہا کئے گمزنہ موئی

موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی
تیری جفا پہ دل سے جب آہ بھی نہ نکلی
کچھ امید جواب میں گزری
مر جاتے اگر جے ہوتے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے، مگر
دشمن جاں تھے تو جان مدعا کیوں ہو گئے
جینے بھی نہیں دیتے، مرنے بھی نہیں دیتے
شکوہ نہ کر فغان کا وہ دن خدا نہ لائے
کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی

اب فراق کی شاعری کو لیجئے۔ میں آج تک سمجھتا تھا کہ وہ شاعری نہایت ہی سطحی اور بے جان ہوئی ہے جس میں بنیاد پر متضاد چیزوں میں مصنوعی اور غیر حقیقی ربط ثابت کرنے کی کوشش ہو۔ اجتماعِ ضدین یا اتحادِ تضاد ایک صنعت ہے شاعری نہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ فراق صاحب کو اس صنعت کے استعمال پر

ناز ہے، نیز اکثر ناقدین بھی اس بنا پر ان کی مدح میں رطب اللسان ہیں ہر چند اس شاعری کی بے باکی ظاہر ہے جس کی ساری کائنات اجتماع ضدیں ہو۔ یاد رہے فراق صاحب کا یہ مذہب نہیں معلوم ہوتا کہ تضاد اشیا سطلی ہے اور ان کی تہ میں ایک ہی حقیقت کا فرما ہے جس کو برا فکندہ نقاب کرنا شاعر کا فرض ہے۔ اس کے برخلاف وہ زندگی اور شاعری دونوں کو تعطل محض یا دماغی ورزش میں متقل کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ فرماتے ہیں: ”شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو آئینہ بنانا مقصد زندگی ہے۔“

”مقصد شاعری“ کہتے تو مجھے اختلاف نہ ہوتا۔ مقصد زندگی ہلکراؤنوں نے زندگی اور شاعری دونوں کی حقیقت سے لاعلمی ظاہر کی۔ حقیقی زندگی اُن وقتی واقعات سے بالاتر ہے جو روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں ایسے واقعات قلمبند کرنا شاعری سے نہیں بلکہ عمرانیات یا تاریخ سے متعلق ہے۔ فراق صاحب کی شاعری کے مساعی بس اتنے ہیں کہ زندگی کے تلخ واقعات کو خوشگوار کر دکھایا جائے، یہ شاعری نہیں خود فریبی ہے۔ اگر انھوں نے شاعرانہ الہام کی روشنی میں زندگی کی حقیقت پر غور کیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہوامیدیم کے کھلونوں کو توڑ کر خود اپنی قدرت سے لذت اندوز ہونے کا ظاہر و باطن کے امتیاز کو مٹا دینے کا۔ اس یقین کا کہ زندگی واحد اور غیر منقسم ہے اور ایک ابدی طاقت اس کا مرکز بھی ہے، نظر بھی ہے اور درمیانی فضا بھی اسی سے معمور ہے۔

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بجز جوش میں گرداب کیسا موج کہاں ہے، حباب کیا

(یہ شعر تیر کا ہے جسے بے بصیرت قنوطی شاعر کہتے ہیں!) لطف یہ ہے کہ جو لوگ شاعری کو ان رفتوں پر پہچاننا چاہتے ہیں اُن کی شاعری حقیقت سے دور اور زندگی کی مفسر نہیں سمجھی جاتی اور سمجھی کیونکہ کہ جاب جب زندگی کا مقصد نفس پروری اور کثافتوں میں آلودہ رہنا ٹھہرے۔ ایک ناقد جس چیز کو فراق کی ”اکھڑی اکھڑی سی منور اور دلکش بات“ سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل ترغ کا فقدان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق پہلے کچھ نثر میں تحریر کرتے ہیں پھر اُس کو نظم کا چولا بدلوانا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر ایک جامہ زیب معشوق کے بجائے کفن میں لپیٹی ہوئی میت معلوم ہوتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔

تیرے چھونے سے بھی دکھے جو کون اُس دل کی پھانس نکالے

جس کے کانوں کو موسیقی سے ذرا بھی لگاؤ ہو گا وہ شعر کاٹ دے گا لیکن لفظ ”جو“ اُس مقام پر نہ رکھیگا جہاں مصرعہ ادنیٰ میں واقع ہے۔ شعر کا سارا طاسم ”دل کی پھانس نکالنا“ محاورہ پر قائم کیا گیا ہے، پھر پھانس جو محض بر بنائے محاورہ پھانس (خلش) اور غیر مری تھی اصلی پھانس بن گئی جو چھوٹی بھی جاسکتی ہے اور نکالی بھی جاسکتی ہے ایسے شعروں سے بچے ہی سکتے ہیں۔ کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر بات پہنچتی ہے کہاں سے کہاں پہلا مصرعہ بچکیاں لے رہا ہے۔

بھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رکی کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

”آج پھر“ جس طرح واقع ہے فصاحت کا گلا گندھیری سے ریت رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر کی تخیل شعری خلاق نہیں بلکہ اُس کے منہ میں ایک نوالہ ٹھونس دیا گیا ہے جو اُس نے بادل ناخواستہ بیابا مگر حلق سے نہ اتر سکا اور گھبرا کر اگل دیا۔ فراق کے اکثر اشعار ایسے ”روایتی“ ہیں جن کے خدوخال چاٹ کر میڈیکل جاتے ہیں۔

میرے لڑکپن تک پہیلیوں اور کمرنیوں کے ساتھ دو بخنوں کا عام رواج تھا، انکی بنیاد اُنل ہے جو چیزوں میں وجہ مشترک بیان کو زیر ہوتی تھی اور اسکا مدار ایک دو معنیوں لفظ پر ہوتا تھا۔ مثلاً:۔ سوال = (۱) گوشت کیوں نہ کھایا (۲) ڈوم کیوں نہ گایا۔ جواب = گلا نہ تھا۔ سوال = (۱) انار کیوں نہ چکھارا (۲) وزیر کیوں نہ رکھا۔ جواب = دانا نہ تھا۔ کچھ اسی قسم ربط فراق صاحب کے معیار شاعری و مقصد زندگی کے مابین ہے۔ اُنکی شاعری نفسیاتی گتھیوں کو سلجھاتی تو کیا ہے، البتہ خود ایک نفسیاتی گتھی ہے۔ اُنکے انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں مگر کمتر:۔

اُن فسون سماں نگاہ آشنا کی دیر تھی اس بھری دنیا میں تم تنہا نظر آنے لگے

نگاہ یار کب تک یہ فریب ہمت افزائی یہیں تک عشق شکل تھا یہیں عے عشق آسان

ابھی غطرت سے ہونا ہے نایاں شان انسانی ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

چل گئی کیا جانے کیسی ہوا آج بچے دل سے بھی اُٹھا دھوا

انقلاب آیا تو یوں آیا نگاہ یار میں کچھ مروت میں اضافہ کچھ محبت میں کمی

”پنی جسے چاہیں وہی سہاگن“ ورنہ کہاں حسرت اور فانی اور کہاں فراق۔ کوئی تنگ ہی نہیں۔ نگار کے باقی تنقید نگار آل احمد سرور، مجذوب گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر اور خود نیا صاحب ہیں جو پہلو اتفاق یا اختلاف کے تحتہ ضمن اس مضمون میں آگئے۔ فردا فردا بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔ (خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

باب المراسلۃ والمناظرۃ

جوشش کے خلاف فتوائے دارورسن

(جناب نسیم بہاری - رکن ادارہ "فطرت" راجگیر)

مکرمی - جوشش کی شاعری اور خیالات سے متعلق جناب اصغر سجاد جعفری نے اپنی رائے پیش کی ہے، جو یہاں بڑی مقبول ہوئی۔ آپ کے مقرر سال میں بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں، امید کہ اپنی رائے کے ساتھ شایع فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں گے۔ وہ تحریر یہ ہے :-

جوشش کو سننے کے بعد

(از اصغر سجاد جعفری)

جوشش کی زبانی اور ہستی کی کہانی یہی کتاب "حرف آخر" ہے جو اندنوں جوشش ملیح آبادی لکھ رہے ہیں۔ چند ماہ میں یہ کتاب نظر عام پر آجائے گی "حرف آخر" کو مصنف کی زبان سے سننے کا موقع ملا۔ کتاب چونکہ غیر مطبوعہ ہے اس لئے شاید مجھے اس پر کچھ لکھنا نہیں چاہئے تھا۔ لیکن جن خیالات کے ساتھ یہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ مذہب اور خدا کی توہین ہے اس لئے اس کے نقایص کا بتا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے شاعر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ترمیم کر سکے!

جوشش کے کلام سے بغاوت کی ہوا آتی ہے، حکومت ہی کے خلاف نہیں، موجودہ تہذیب ہی کے خلاف نہیں، دور حاضر کے اصولوں کے ہی خلاف نہیں، بلکہ قسمت کے خلاف، تقدیر کے خلاف اور خود خدا کی خلاف! اگر حکومت کے خلاف انھوں نے اپنی نظموں میں بغاوت کی تو وہ بغاوت نہیں جنگ آزادی کا نعرہ تھا، اگر موجودہ تہذیب اور موجودہ انسانیت کے خلاف انھوں نے بغاوت کی تو میں کہوں گا وہ صحیح ہیں کیونکہ انسانیت دنیا سے ناپید ہے۔ سچائی انصاف دنیا میں باقی کہاں ہیں؟ یہاں تک تو میں سمجھتا کہ جوشش نے انسان کی ہستی کو محسوس کیا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا ہے، مگر جوشش صاحب حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے مذہب کی دھجی اڑانے کی ٹھانی ہے اور خود خدا کے خلاف ہی اعلان جنگ کر دیا ہے، کتاب "حرف آخر" میں جو ادبی کمالات ہیں اس کی بنا پر یہ تو اس قابل ہے "نوبل پرائز" دیا جائے مگر جوشش خود اس قابل ہیں کہ "اس شاعر گستاخ کو سولی پر چڑھا دو" ہر پابندی کو توڑ دینا اور ہر اصول سے بغاوت کرنا یہ جوشش کی شاعری ہے۔ انسان لامحدود ضرور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان قیود و بند کو بھی توڑنے کی کوشش کرے جو انسانیت کی تکمیل کے جز ہیں جسم میں روح کا قید ہونا کیا کم پابندی ہے؟ مگر یہ پابندی توڑی نہیں جاسکتی۔ زہر پینے کے لئے یہ پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح بہت سی ایسی پابندیاں ہیں جنہیں اگر توڑ دیا جائے تو کل یہ بھی پتہ نہیں رہے گا کہ کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا بیٹا کون کس کی بہن ہے اور کون کس کی بیوی۔ اس پابندی سے جانور آزاد ہیں اور دنیا ان کی حالت جانتی ہے ادنیٰ ایک پابندی ہے اور یہاں رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ پابندی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے کپڑے کم سے کم کر دے مگر وہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی تنگا ہو کر بازار سے گزر جائے۔ ہوش سے گزر جائے تو شاید کر سکے۔ کپڑا ایک پابندی ہے مگر دور نہیں کیا جاسکتا! بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاعری انسانی زندگی کی رہبر ہے، انسانی تہذیب کی جزو و اعظم ہے یہ وہ شاعر جو حقیقت سے دور اور ہر پابندی سے آزاد ہو صحیح معنوں میں شاعری ہی نہیں۔

جوشش صاحب نے "حرف آخر" باب بابت سنایا۔ چنانچہ پڑھتے پڑھتے وہ وہاں پر پہنچے ہیں جہاں خدائے عزوجل ہر شخص کا ضمیر دیکھ رہا ہے۔ جوشش صاحب نے ہر شخص کا

ضمیر لکھا ہے، امام مسجد کا ضمیر، ایک خالص صاحب کا ضمیر، ایک ہوس پرست کا ضمیر، ایک سود خوار کا ضمیر، ایک ڈاکٹر کا ضمیر، ایک وکیل کا ضمیر، اور دکھایا کہ سب کے سب ہی پستی کے تاریک غار میں گرے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جوش صاحب کو ایک آدمی بھی نہ ملا جو پاکباز ہو، سچا ہو، خدا کا پرستار ہو، اس زمانہ میں بھی جب دنیا ایسے لوگوں سے خالی ہے ایک دو تھوڑے ورطیں گئے اور اگر واقعی انھیں کوئی ملا ہی نہیں تو کم از کم پاکبازی اور سچائی کا ان کے نزدیک ایک معیار تو ہو گا وہ اسی کو پیش کرتے، ضمیروں کی فہرست میں کمی ہے۔ "غریب کا ضمیر نہیں لکھا گیا۔" شاعر کا ضمیر نہ لکھنا جوش کی شکست ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ جو اپنے کو نہیں دیکھ سکتا وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتا اور جوش صاحب دنیا تو کیا ذرا تک دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہیں دیکھ سکتے تو اپنے کو! یہ افسوسناک ہے!!

کتاب "حرف آخر" اگر دنیا کے سامنے آئی اور مقبول ہو سکی تو مجھے افسوس ہو گا کہ ایک ایسا نازشامکار مقبول نہ ہو سکے اور اگر مقبول ہوئی تو مجھے صدمہ ہو گا کیونکہ یہ کتاب خدا اور مذہب کی توہین ہے۔ اس دن جب جوش صاحب نے بیجا باتیں خدا کی شان میں کیں اور لوگوں نے سنی تو میں یہ کیسے امید کروں کہ لوگ اس کتاب کو اچھا نہ سمجھیں گے کوئی دن وہ بھی تھا کہ لوگ جمع ہوتے تھے اس لئے کہ خدا کی تعریف اور حمد کریں، کوئی دن وہ بھی تھا جب لوگ خدا کے اصولوں کو سینے سے لگائے دنیا کے سرگوشے میں پھیلایا کرتے تھے وہ زندہ رہتے تھے تو خدا کے لئے اور مرتے تھے تو خدا کے لئے، اور ایک دن آج ہے جب اپنے سے بخیر لوگ عالم بے خودی میں کیا کیا نہ کہہ جاتے ہیں اور خدا کے بند حلقہ باندھ کر داد واد کرتے ہیں! شاید انسانی پستی کی یہ آخری حد ہے!!

(نگار) میں تو خیر نسیم بہاری صاحب اور اصغر سجاد جعفری دونوں سے ناواقف ہی ہوں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی مجھ سے ناواقف ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ تحریر میرے پاس نہ بھیجتے اور اگر بھیجتے بھی تو میری رائے چاہنے پر اصرار نہ کرتے۔

میں جوش کی اس نظم کے بعض حصے اُن سے سن چکا ہوں اور بس وقت میں نے اسے سنا تو جوش صاحب کو مشورہ دیا کہ اس نظم کے بعد انھیں شاعری ترک کر دینا چاہئے کیونکہ جس رنگ کے وہ شاعر ہیں اس رنگ میں یہ نظم "حرف آخر" کی حیثیت رکھتی ہے۔

جوش طنز نگار شاعر ہے اور باوجود نامناسب تلخیوں کے بھی اس کا طنز کلام اپنی جگہ ایک خاص مرتبہ ایک مخصوص منزلت رکھتا ہے اور محض اختلاف خیال و عقاید کی مخالفت کی بنا پر اس کے وزن کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بالکل غلط ہے کہ جوش نے اس نظم میں خدا و مذہب کی توہین کی ہے۔ اس تصور کی مخالفت کی ہے جو خدا و مذہب کے متعلق عام طور پر قائم کیا گیا ہے اور اُن لوگوں کے روایات کی تضحیک کی ہے جن کو اندھی تقلید کرنے والوں نے "اساس مذہب" سمجھ رکھا ہے۔

جوش نے اس نظم میں مذہب کا مفہوم "خالص انسانیت" قرار دے کر مذہب کے تمام روایتی لٹریچر کو اسی معیار پر جانچا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص مذہب کا معیار اتنا بلند قائم کرے گا، وہ دنیا کے موجودہ "پابند رسوم و قیود" مذہب کو دیسا ہی پائے گا جیسا جوش نے ظاہر کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جوش کی یہ نظم واقعی ایک "لمحہ منکر" کی نظم نہیں ہے، کیونکہ خدا و رسول کا انکار کرنے کے بعد بھی وہ اپنے عقاید و رجحانات کی بنا پر دائرہ "تشیع" سے باہر نہیں نکل سکتے اور اگر اس نظم کے وزن کو ہلکا کرنے والی کوئی چیز ہے تو صرف یہی کہ وہ ایک "خالص لمحہ منکر" کی نظم نہیں ہے۔ لیکن اگر تم تھوڑی دیر کے لئے اسے مان لیں کہ جوش نے واقعی اس نظم میں خدا و مذہب کی توہین کی ہے، تو بھی اس پر برہم ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ایک شخص کو بجز مذہب کا پابند بنائیں اور جب وہ اس جبر سے پناہ مانگے تو اس کو "دار و رس" کا مستحق قرار دیں، جبکہ مذہب کی "دار و رس" لوگوں کے خیال و زبان کی آزادی کو چھیننے سے اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت جوش کی یہ نظم شائع ہوگی، مذہب پرستوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ ہنگامہ تو باقی نہ رہے گا اور جوش کی نظم ہمیشہ باقی رہے گی۔

معلوم نہیں جناب نسیم بہاری اور اصغر سجاد جعفری نے دریا باد اور اعظم گڑھ کے خاتوا دوں کو بھی اس آنے والے فتنہ سے آگاہ کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اب سہی، کیونکہ اس قسم کی باتیں سمجھنے اور داد دینے والے "روح القدس" وہیں رہتے ہیں۔

مکتوبات نیاز

آپ بھی عجیب چاہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ”ساقی ہے دلربا“، مے کی تندہی و تلخی کی شکایت کرتے ہیں۔
 میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو لگے بند کر کے اپنے آپ کو اس سیلاب رنگ و بو کے سپرد کر دیتا
 میرا ارادہ اخیر رہتا میں وہاں جانے کا ضرور تھا، لیکن اسی زمانہ میں میرے ایک کرمفرما یہاں آ رہے ہیں اور
 ایک کام سے آ رہے ہیں، اس لئے تفریح کا سفر ملتوی۔ وسائل نقل و حرکت باقی رہے تو شاید اپریل کے وسط میں
 پھر ارادہ کروں گا، مگر غالباً تکمیل کی نیت سے نہیں! — آپ کو کیا معلوم کہ میں نے دنیا کی وسعت کو کتنا تنگ کر لیا ہوں!
 جسوقت مکان کے ایک گوشہ سے چلکر دوسرے گوشہ میں پہنچتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی
 تک کا سفر طے کر لیا! آپ اسے ضعف و کمزورت کہیں گے اور میں قناعت! مگر مولویوں اور صوفیوں والی قناعت نہیں جسکے
 آگے قارون کی حرص و طمع بھی شرماتی ہے، بلکہ ساری دنیا کو ٹھکرا کر فاقہ کرنے والی قناعت!
 آپ کو اپنے علاقے کے لحاظ سے بے شک پریشان ہونا چاہئے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بمباری لکھنؤ اور
 بنارس پر تو ہوتی نہیں، رہا بد امنی کا اندیشہ، سو اس کے متعلق سو اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب طوفان سے بچنے کی
 کوئی صورت نہ ہو، تو طوفان ہی میں اپنے آپ کو ڈال دینا چاہئے۔

کیوں صاحب، یہ تحایف کی تقسیم خویش سے گزر کر درویش تک پہنچی ہی نہیں یا
 چوں در خسرو آمدے در سبب نماندہ

خوش رہئے، آپ کے یاد نہ کرنے میں بھی لطف ہے

ہاں، جھانسی سے وہ تبدیل ہو گئے ہیں اور ایسی جگہ پہنچے ہیں کہ خضر، شاید چشمہ حیواں تک تو پہنچ جاتے،
 لیکن یہاں تک وہ کبھی نہ پہنچ سکتے۔ دس میل فی گھنٹہ چلنے والی ریل سے ۴۸ گھنٹے کا سفر کر کے ایک ایسے اسٹیشن پر
 اترے، جہاں آپ کو صرف ایک تنفس نظر آئے گا، جو غریب قلی بھی ہے اور بابو بھی! اس کے بعد کہیں بیل گاڑی سے
 اور کہیں پیادہ یا ۸ میل کی وہ منزل طے کیجئے جس میں آپ کو کم از کم پانچ پہاڑ، دس دریا اور بیس صحرا عبور کرنا ہیں۔

پھر کہیں جا کر آپ یا آپ کی لاش اُن حضرت کے آستانہ تک پہنچ سکے گی !
آپ جاتے ہوں تو جائے، لیکن مجھے بخشنیے۔ اتنی تکلیف اٹھا سکتا تو آج حاجی ہوتا !

بجا ارشاد ہوا، لیکن مجھے آپ کے استدلال سے اختلاف ہے۔ بیشک پردہ اور اس حد تک پردہ کہ
نقاب عارض گل جوش می کند مارا

کوئی معقول بات نہیں، لیکن بے پردگی کے جو برکات آپ نے شمار کرائے ہیں اُن سے ضرور مجھے اختلاف ہے۔ ہو سکتا ہے
کہ پایا بن کار بے پردگی ”رواج معصومیت“ میں معاون ہو، لیکن اس کا تعلق ہمارے آپ کے اخلاق کی باندی سے
نہ ہوگا بلکہ صرف اس بات سے کہ دنیا کی ہر وہ چیز جو ہماری دسترس سے قریب ہے، دل سے دور ہے

صحت کا مسئلہ بیشک قابل غور ہے، لیکن اس وقت کی بے پردہ ہندوستانی عورت (مغرب کی عورت کا ذکر نہیں
کہ وہ تو واقعی مرد بن گئی ہے) شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کی صحت پر رشک کیا جائے۔ حوائی تو گیہوں کے لئے جنت چھوڑی تھی
لیکن حوائی یہ بیٹیاں اب نازک بننے کے لئے غذا ہی ترک کر بیٹھی ہیں، وہ نقاہت و نزاکت کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں، بڈیوں
کے ڈھانچے پر منڈھی ہوئی کھال، سفید دھوئے ہوئے کپڑے کا سارنگ، دھنسنے ہوئے گالوں میں ڈگڈگاتی ہوئی آنکھیں
یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومیائی شدہ لاش میں مضحل سی جان پڑ گئی ہے

چھریا جسم، کشیدہ قامتی، بیشک رعنائی میں داخل ہے، لیکن ہر ہریلہ سے نکیلی ہڈیاں چھو دینے والی عورت تو
ایک مستقل خطرہ ہے، رعنائی سے اسے کیا واسطہ !

یہ درست ہے کہ اس کی ظاہری زیبائش و آرائش، جس کو اس نے اسکولوں اور کالجوں میں فن کی حیثیت سے
حاصل کیا ہے، اس کے بہت سے نقایص کو چھپا دیتی ہے، لیکن معیاری حُسن تو وہی ہے جو لباس سے جدا ہونے کے
بعد اور نمایاں ہو جائے، نہ کہ بالکل ختم !

”جنسیات“ سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ ”تمدنی“ حیثیت سے غور کریں گے تو حالت اور زیادہ
افسوسناک نظر آئے گی۔ خانہ داری، تربیت اولاد، اقتصادی نگہداشت، وغیرہ جن میں دستگاہ اٹھنا عورت کا
حقیقی حُسن ہے، سو آپ کو اس کا شاید زیادہ دردناک تجربہ ہوگا !

مصیبت یہ ہے کہ ہمارے مذہب کی طرح ہماری ساری معاشرت تقلیدی ہے، عورت کی بے پردگی کا کیا ذکر !
ہماری معاشرت کے دوسرے مسائل کی طرح پردہ کے لئے بھی کوئی اصول موضوعہ مقرر نہیں کیا جاسکتا، زناء و ضرورت
کے لحاظ سے ہمیشہ اس میں تبدیلی پیدا کرتا ہوگی۔ تعلیم بے شک عورت کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے لئے
لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے

پردہ تو اس نسل سے میرے یہاں بھی ختم ہو گیا ہے، لیکن میں نے اپنی لڑکی کو اسکول نہیں بھیجا، گھر ہی میں پڑھکرانے فارسی میں دبیر ماہر کی سند حاصل کی، پھر بائی اسکول کا امتحان بھی اسی طرح دیا اور سال آئندہ ایف۔ اے میں شریک ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں ”ترقی پسندی“ کی نہیں، لیکن انیسویں صدی کا انسان بیسویں صدی کی مخلوق سے کچھ تو علحدہ ہی ہونا چاہئے۔

محترمہ - میں اپنی بڑھیبی کا رونا کہاں تک روؤں، ایک وقت تھا

کہ می رفتی و طاقت می رسید از من

یا اب یہ حال ہے کہ آپ سے ملنے کا خیال بھی کوئی مسرت نہیں پیدا کرتا! اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے! تاہم آپ کی دلچسپی کا شکریہ ادا کرتا ہوں

یہ آپ نے خوب فرمایا کہ میں دونوں جہاں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ کاشکے ایسا ہی ہوتا۔ بہر حال خوش ہوں کہ گفتگو میں میری تمنا کی رعایت اب بھی آپ کو ملحوظ ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ جوابات آپ کہتی ہیں وہ کسی وقت پوری ہو جائے ایک زمانہ تھا جب ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ

تسکین بچہ بخشم دل ہنگامہ گزس را

یا اب یہ حالت ہے کہ ہزار کردیش لینے کے بعد بھی دل میں کوئی غیر معمولی دھڑکن پیدا نہیں ہوتی، ہنگامہ کیسا! اس کا علاج اگر آپ کے پاس کوئی ہو تو بتائیے، خالی طنز سے کام نہیں چلتا

اُن کے حال سے بالکل بے خبر ہوں۔ عرصہ ہوا ایک خط علی گڑھ سے آیا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ایک دل اپنے کام کا انھیں آخر کار مل ہی گیا۔ ان کا غیر معمولی سکوت، سکون کی علامت ہے، اس لئے میں بہت خوش ہوں، خدا کرے ان کی ”ادبیت“ انھیں ایک جگہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دے

حضرت - آپ کے خط کا جواب دوں بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ جو خدا کو بے دلیل ماننے والا ہو اس کے سامنے حجت و استدلال پیش کرنا، اب کیا کہوں کہ کیا ہے۔

میں کہوں گا ”عقل تو ایسا نہیں کہتی“، آپ فرمائیں گے ”عقل کیا چیز ہے“۔ میں عرض کروں گا کہ ”اسباب کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں“، آپ کہیں گے کہ ”مشیت ایزدی“ میں کس کو مجال دم زدن ہے۔

پھر آپ ہی فرمائیے کہ اس ”قدرت و مشیت“ کا علاج میرے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نمرود کو اس لئے برا کہتے ہیں کہ اس نے ”خلیل اللہ“ کو اس میں ڈالکر بلانا چاہا، میں کہتا ہوں کہ ”طرح گلستاں“ ”آتش نمرود“ ہی نے ڈالی

من آتش از دغاں بنیم تو از آتش دغاں بینی

آپ کا خدا اور مذہب، دونوں بہت نازک ہیں، اس لئے مجھے خاموش ہی رہنے دیجئے تو بہتر ہے۔

وقت کی باتیں

تک عشرہ کاملہ

بالشیوکی نظام حکومت اس وقت جن دماغوں کا رہن منت ہے، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اسٹالین کو ملا کر یہ تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ ۱۔ اسٹالین اس وقت حفاظت ملک کی مجلس کا روح رواں ہے اور اپنے چار دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ملکر ملک کو بچانے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ان چار ساتھیوں میں دو پرانے بالشیوکی ہیں یعنی مولوٹوف اور دارشلان اور دو نوجوان ممبر، بیریا اور مالنکوف۔ دس آدمیوں کی یہ جماعت "Politburo" کہلاتی ہے، یعنی تمام اشتراکی جماعتوں کی مرکزی کمیٹی کا پولٹیکل بیورو۔ بالشیوکی نظام میں ایک سوپریم کونسل (پارلیمنٹ) ہے اور دوسری کینٹ جو تمام جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، لیکن اختیار کامل اسی پولٹیکل بیورو کو ہے۔ اسٹالین جسے وہ غازیان (Kazansky) یعنی سردار کے نام سے پکارے ہیں، اپنے ان نو مشیروں کو جمع کر کے رائے طلب کرتا ہے اور پھر جو فیصلہ ہوتا ہے اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

۲۔ مولوٹوف - ۱۹۱۲ء سے اسٹالین کا دست دباؤ ہے۔ اس کی عمر ۵۲ سال کی ہے۔ امور خارجہ کا وزیر ہے۔ جب اس کی عمر ۹ سال کی تھی تو آرمی کے حکم سے قید کر دیا گیا تھا، لیکن بعد کو رہا ہو گیا۔ روس کے مشہور اخبار پر آؤد کا نامہ نگار بھی رہا ہے اور لینن کا معتمد بھی۔ اسٹالین نے اس کی دماغی اہلیت کا اندازہ کر کے زیادہ ذمہ دار کاموں پر لگایا، یہاں تک کہ اب وہ اسٹالین کا خاص آدمی سمجھا جاتا ہے۔ یہ روس کے تاریخی حصہ کا رہنے والا ہے۔ ۳۔ اینڈریوچ (Andreyev) - یہ کمیونسٹ پارٹی پر کنٹرول رکھنے والی کمیشن کا پریسیڈنٹ ہے۔ اس کی عمر ۴۴ سال کی ہے اور اسمولنسک کا باشندہ ہے۔ اول اول یہ کسی ہوٹل میں کام کرتا تھا اور پھر پٹر و گراڈ کے اسلحہ سازی کے کارخانہ میں۔ اس کی تعلیم کم ہے، لیکن فراست و تدبیر میں کسی سے کم نہیں۔

۴۔ مالنکوف - اس کی عمر ۴۰ سال کی ہے اور اشتراکی سیاست کا ماہر ہے۔ اس نے ۱۹۲۲ء میں اشتراکیت کو اختیار کیا اور غیر معمولی قابلیت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ آج وہ سنٹرل کمیٹی کے سکریٹریوں میں شامل ہے اور اسٹالین کے تمام دفتری کام کا ذمہ دار ہے۔

۵۔ اینڈریوچ (Andreyev) - اس کی عمر ۴۴ سال کی ہے۔ یہ لینن گراڈ کے حلقہ میں کمیونسٹ جماعت کا سردار ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب اس کی عمر ۱ سال کی تھی اس نے بالشیوکی مسلک قبول کیا۔ یہ فلینڈ پر حملہ کرنے والی رائے کا بڑا موید تھا اس نے اول اول یہ لگایا تھا، لیکن چونکہ فلینڈ کے بعض فوجی مقامات جن پر روسی قبضہ ہو گیا تھا، جرمنی کے خلاف جنگ کرنے میں مفید ثابت ہوئے اس لئے پھر وہی عزت اسے حاصل ہو گئی ہے۔ اس نے سیاست خارجہ پر بہت کچھ لکھا ہے اور اسٹالین اسے ایک ذہین نظر بنانے والا کہتا ہے۔

۶۔ رنٹی پادوچ بیریا - ۴۲ سال کی عمر ہے اور سوویت خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہے۔ ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۷ء میں (۱۹۳۵ء میں جماعت کے افراد نکالنے میں) (جو سوویت حکومت کے خلاف تھے) اس نے نمایاں خدمت انجام دی۔ اس نے انقلاب روس کی ایک تاریخ لکھی ہے جس میں اسٹالین کو انقلاب قاف کا ہیرو ثابت کیا ہے۔ اسٹالین کے مشیروں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ یہی شخص ہے۔

۷۔ یوروشلان - مجلس حفاظت ملک کی کمیٹی کا نائب صدر ہے اور فوج کی نمائندگی کرتا ہے، اس کی عمر ۶۰ سال کی ہے۔ پہلے گلہ بانی کیا کرتا تھا، اس کے بعد معدنوں میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۸ سال کی عمر میں قید ہو گیا تھا۔ سوویت فوج میں وہ بہترین سپرول چلانے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسٹالین کا نہایت خاص آدمی ہے۔ اس وقت روس بوزبرد دست مداخلت کر رہا ہے اس کا امتیاز اسی شخص کو حاصل ہے۔

۸۔ لازار کاگنودچ - ۴۸ سال کی عمر ہے اور پولٹیکل بیورو میں سب سے زیادہ قابل شخص سمجھا جاتا ہے۔ وادی ڈون میں زراعت و صنعت کی ترقی

دینے کا سہرا اسی کے سر پہ، ریلوے اور پٹرول کے معاملات کا بڑا ماہر ہے۔ اسٹالین اس پر بہت اعتماد رکھتا ہے۔

۹۔ مکوائن - ۴۶ سال کی عمر ہے۔ آرمینا کا باشندہ ہے۔ غذا اور تجارت کے مسئلہ کا ماہر خصوصی ہے۔ بیرونی تجارت کا وزیر ہے۔ شائع سے اسٹالین کی جماعت میں شریک ہے۔ جب انقلاب روس کے بعد سولہ وار شروع ہوئی تو انگریزی فوج نے اسے گرفتار کر کے سفیر روسیوں کے حوالہ کر دیا، لیکن اُس وقت یہ اتنی کم اہمیت رکھتا تھا کہ کسی نے پروا نہ کی۔ یہ اسٹالین کا نہایت راز دار دوست ہے۔

۱۰۔ کالیٹن - پُرانے بالشیوکوں میں سے اب بھی ایک رہ گیا ہے۔ اس کی عمر ۶۶ سال کی ہے۔ سوویت کونسل کا پریسیڈنٹ ہے۔ ایک کاشتکار خاندان کا فرد ہے اور زراعت پیشہ طبقہ کا نمائندہ۔ ۲۴ سال کی عمر میں یہ قید ہو گیا تھا۔ اپنی سیاسیات میں یہ نسبتاً قدامت پسند واقع ہوا ہے، لیکن ملکیت کا سخت مخالف ہے۔

مشرق میں ڈچ مقبوضات سے مراد وہ چند جزائر ہیں جو بحر ہندوستان کے شرقی شمال گوشہ پر واقع ہیں۔ انھیں کوائسٹ انڈیز کہتے ہیں، جن کا نام آجکل ہر اخبار میں نظر آتا ہے۔ انھیں جزیروں میں ایک جزیرہ جاوا بھی ہے، جس پر جاپان نے حال ہی میں قبضہ کیا ہے۔

جاوا پر قبضہ جاپان کی اہمیت

جاوا اور اس سے ملے ہوئے جزیرہ مدورا کا رقبہ صرف ۱۰۵۰ مربع میل ہے، لیکن آبادی ۴۰ لاکھ ہے۔ گویا تمام ڈچ ایسٹ انڈیز کا ۱/۲ حصہ یا جاپان کا نصف یہاں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور جنوبی ایشیا میں جتنی تہذیبیں اس وقت تک قائم ہوئی ہیں ان سب کے نشانات یہاں ملتے ہیں، لیکن بودھ مت کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ جاوا قدیم الایام سے بہت زرخیز اور آباد رہا ہے۔ روم سلطنت کے جغرافیہ دانوں نے بھی اس کا ذکر سونے اور چاول کی سرزمین کے نام سے کیا ہے اور قدیم چینی سیاحوں نے بھی (جب یورپ عہد تاریکی کی زندگی بسر کر رہا تھا) یہاں کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے۔

یہاں کا خاص مقام بناو یا ہے جو تمام ایسٹ انڈیز کا پایہ تخت ہے۔ اس کو سترھویں صدی میں ڈچ کے ایک گورنر جنرل نے آباد کیا تھا اور اب رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۵ لاکھ آبادی رکھنے والا، نہایت ہی تمدن شہر بن گیا ہے جس میں ایک یورپین شہر کی سی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی میں جب یہاں کی تجارت بڑھی تو بناو یا کے پُرانے بندر گاہ کو نا کافی سمجھا گیا اور ایک دوسری گودی ۱۸۸۶ء میں ۵ میل کے فاصلہ سے طیار کی گئی چنانچہ یہ گودی مشرق بعید کی نہایت آراستہ وسیع بندر گاہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بناو یا سے یہاں تک برقی ریلیں، موٹر بسیں اور نہروں کے ذریعہ سے موٹر کشتیاں ہر وقت آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ بناو یا، ڈچ ایسٹ انڈیز کا نہایت اہم تجارتی مرکز ہے اور یورپ کی طرف سے آنے والوں کے دروازہ کا حکم رکھتا ہے۔

جاوا، شکر، چاول، مسالہ اور ربڑ کی پیداوار کے لئے خاص شہرت رکھتا ہے۔ ۸ کروڑ ایکڑ سے زیادہ یہاں چاول کی کاشت ہوتی ہے اور میدانی علاقوں کے علاوہ یہاں کا کوہستانی علاقہ بھی اپنی معدنی پیداوار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ، سونا، چاندی، مین، کوئلہ، پٹرول بھی یہاں کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ زراعتی اشیاء میں علاوہ چاول کے تاکو، چار، کافی اور شکو نا بھی یہاں بہت پایا جاتا ہے اور عمارتی لکڑیوں کے جنگل بھی بہت ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بہت معتدل اور درجہ حرارت ۷۷ اور ۹۷ ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔

جس وقت جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کیا تو ڈچ ایسٹ انڈیز پر جاپان نے دانت جمایا۔ کیونکہ اب ہالینڈ کی حکومت ہی ختم ہو گئی تھی اور وہ ادھر کچھ نہ کر سکتی تھی چنانچہ پٹرول حاصل کرنے کی بہت سی رعایتیں، جاپان نے حاصل کر لی تھیں، لیکن اب پانسفک کی لڑائی شروع ہونے کے بعد جاپان نے ان جزیروں پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور سنگاپور کے بعد جاوا کا جاپان کے ہاتھ میں چلا جانا اس لڑائی کا اتنا اہم واقعہ ہے کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نقشہ اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ جاوا کے قبضہ کے بعد آسٹریلیا اور ہندوستان کا تعلق، جاپان نے بالکل منقطع کر دیا ہے اور اب اگر کوئی مدد آسٹریلیا کو پہنچ سکتی ہے تو صرف امریکہ کی طرف سے اور وہ بھی اُن راستوں سے جو کم جانے بوجھے ہیں اور جن پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ چونکہ جاوا کی موجودہ آبادی زیادہ ملایا کی سی ہے، جو قومی و معاشرتی حیثیت سے جاپان کے قریب ترین، اس لئے اندرون ملک میں جاپان کے خلاف کسی انقلاب کی امید نہیں کی جاسکتی۔

قاف - سرزمین عجائبو غرائب کی روایات ہمارے یہاں ایک ایسی سرزمین سے متعلق تھیں، جہاں صرف پریاں رہتی ہیں اور انسان کی رسائی وہاں تک دشوار ہے۔ جب موجودہ جنگ میں جرمنی نے یورپ کے جنوبی مشرقی حصہ پر حملہ کیا تو بہت سے عجیب و غریب نام جن سے ہم واقف نہ تھے سننے میں آئے اور اسی سلسلہ میں قاف کا نام بھی تھا، جس سے ہم بالکل "قطبین" کی طرح واقف تھے۔

اس وقت تک سیاح بہت سے نامعلوم سمندروں کو عبور کر چکے ہیں اور بہت سے غیر معروف دریا، صحرا اور جزائر کا پتہ چلا کر وہاں کے حالات سے دنیا کو باخبر کر چکے ہیں۔ لیکن سرزمین قاف“ اب تک“ افواہ و روایات“ کی دنیا سے وابستہ ہے اور ہم زیادہ تر قیاس سے کام لیکر قاف کی ایک خیالی تصویر قائم کرنے پر قانع نظر آتے ہیں۔ آپ کسی سے پوچھئے کہ ”قاف“ کی حقیقت کیا ہے لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا، آپ کسی سے دریافت کیجئے کہ وہاں کے باشندے کیسے ہیں، کس زبان، مذہب کے ہیں، کیا زبان بولتے ہیں، اور ان کی معاشرت کیا ہے لیکن آپ کو اس کا کوئی صحیح جواب نہ مل سکے گا۔ اسی کے ساتھ آپ نقشہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قاف کوہ زمین کے مرکز پر واقع ہے اور تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ وہ کسی زمانہ میں قدیم تہذیب کا بھی مرکز رہا ہے۔

آپ ملکوں کی ان حدود کو نہ دیکھئے جو انسان نے قائم کی ہیں، بلکہ جغرافیہ کے فطری حدود کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کے اتنے بڑے خشکی کے رقبہ کا، اور جو یورپ و ایشیا دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح بحر ”سرگاسو“ سمندروں کا بھنور ہے، اسی طرح قاف بھی انسانی آبادی کا بھنور ہے جہاں مختلف قوموں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے طبعی جغرافی کو آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ شاید کسی وقت زمانہ نامعلوم میں، کچھلی ہوئی زمین کے اندر سے ایک بڑی زیر دست چٹان سیکڑوں میل لمبی چوڑی ابھر آئی تھی اور اس کے دونوں طرف جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ پانی سے بھر گیا تھا اور انھیں دونوں خلاؤں کا نام بحر اسود اور بحر کاسپین ہے جن کے درمیان کوہ قاف کا سلسلہ ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے سرزمین قاف نام ہے۔ اونچی اونچی کوہستانی چوٹیوں کے طویل سلسلہ کا عین غاروں کا، عجیب و غریب زرخیز وادوں کا جو باوجود ایک حد تک گرم آب و ہوا کے منطقہ سے تعلق رکھنے کے جاڑوں میں نجد برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس سرزمین پر یونان و روم، میڈیا و ایران، عرب و مصر، چین و تاتار، ترک و آرمینیا، سبھی کی فوجوں کا گزر ہوا ہے اور انھیں یہاں باسکتا کہ ان میں سے کتنے یہاں کی وادیوں میں بھٹک بھٹک کر اور کتنے خود اپنی مرضی سے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سرزمین قاف انسانی آبادی کے تنوع کے لحاظ سے ایک عجیب و غریب ہے اور یہاں دو سو مختلف قومیں آباد ہیں، جو تین سو مختلف زبانیں بولتی ہیں اور جن میں سے بعض کے درمیان دشوار گزار پہاڑوں اور ناقابل عبور وادیوں کے اتنے موانع حایل ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے براہ آسانی مل بھی نہیں سکتیں۔

ان میں بعض قومیں سفید رنگ کی ہیں، بعض سانولے رنگ کی، بعض بھورے اور بعض زرد رنگ کی جن کے عادات و خصایل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہاں تک کہ ان میں بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو عہد بابل کی تہذیب سے ایک انچ آگے نہیں بڑھیں! ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کا مذہب بھی عجیب و غریب ہوگا چنانچہ یہاں عیسائی بھی ہیں لیکن انھوں نے کبھی عیسیٰ کا نام نہیں سنا، یہاں مسلمان بھی ہیں جو رسول اللہ کے نام سے واقف ہیں، یہاں بودہ مذہب والے بھی ہیں جو مسیح کو بودہ سمجھتے ہیں۔ الغرض دنیا کے تمام مذاہب یہاں پائے جاتے ہیں لیکن بالکل نسخ شدہ صورت میں اور ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان میں سے اکثر کی زبان کوئی مکتوبی صورت نہیں رکھتی اور جو محض اس لئے ضبط تحریر میں نہیں آسکتی کہ وہ مجموعہ ہے صرف مبہم سی آوازوں کا جنھیں الفاظ میں منتقل کرنا ممکن ہی نہیں! لیکن باوجود ان تمام وحشتوں کے اس سرزمین میں ہر جگہ آزادی کی لہر دوڑی ہوئی ہے اور آج تک انھوں نے کسی کی غلامی قبول نہیں کی۔ ان کے قانون میں سوائے دو باتوں کے اور کچھ نہیں۔ ایک یہ کہ اگر کسی قبیلہ کا آدمی مار ڈالا جائے تو اس کا بدلہ خون ہی سے لیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر عورت چرائی جائے تو اس کا جواب صرف خنجر سے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے غاروں میں، گلپوش وادیوں میں، پہاڑ کے سبزہ زاروں و تالستانوں اور سرد و صوبہ کے جنگلوں میں خدا جانے کتنے خاندان اسی جذبہ انتقام کی بدولت ابری نیند سو رہے ہیں۔

یہاں کے لوگ ساری دنیا سے علیحدہ اپنی زندگی ایک راز کی صورت میں بسر کر رہے ہیں اور انہیوں کے لئے ان سے خلاط بڑھانے کی کوئی راہ نہیں، ان کے یہاں نہ کوئی کتاب ہے نہ اخبار، اور خبریں سننے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص ان کو بہ آواز بلند سنا دیتا ہے۔

سیاسی حیثیت سے سرزمین مختلف جمہوریتوں میں منقسم ہے جو آفیسر کی مرکزی جمہوریت سے تعلق ہیں۔ ان میں بعض جمہوریتیں کافی بڑی ہیں مثلاً آذربائیجان جہاں ہاگو کے پٹرولی چشمے پائے جاتے ہیں اور جس کی آبادی ۴۰ لاکھ ہے۔ جمہوریت بیلاروسیا کی آبادی ۳۰ لاکھ اور جمہوریت آرمینیا کی ۲۰ لاکھ ہے۔

جب انقلاب روس کے بعد بالٹک لوگ یہاں پہنچے اور انھوں نے بالٹک قومیت کے اصول بتائے تو سرزمین قاف کے لوگوں نے کہا کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے یہاں ہمیشہ سے یہی اصول چلا آ رہا ہے۔ یہ سرزمین اپنا پیردار کے لحاظ سے بہت روئندہ ہے۔ یہاں کی وادیوں میں گہریں، تالاب، انگور، اخروٹ، شفتالو، سونا، چاندی، کوئلہ، لوہا اور پٹرول سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور ہٹلر انھیں پیروں کے لئے یہاں بھی بچنا چاہتا ہے۔

نقوش اثر

(تنبیہ مرکب، کنایہ، استعارہ اور لفظ و نشر کا دلکش انمزاج)

خواب رنگیں:

(۱) صبح نے جھانک لیا غرغہ شب سے ہنسکر
قہر اس پر یہ نسیم سحری کا کہنا
کیا ہی شرمائی ہے آغوش میں گل کے شبنم
”مستیاں خوب ہیں، اتنی نہیں لیکن، کم کم!“

(۲) لاکھ دلکش ہے یہ منظر، مگر اسے جان بہار
اثر عشق سے جب عارض گلگوں پہ ترے
کاش پھر دیکھ لوں اکبار وہ دیکھا ہوا خواب
ہلکا ہلکا سا پسینا تھا، اور آنکھوں میں خمار

تصویر تصور:

جیتے کوئی فرشتہ کہ ہنگام سرخوشی
وہ زیر و بم کہ نرم تموج کہیں جسے
بالکل یہی تصور جاناں کی شان ہے
چھپڑے صبحِ نغمہ سنہرے رباب پر
ہلکی پھوار نور کی حجام شراب پر
جسوقت رات ہوتی ہے پورے شباب پر

نظم ”کاروان حیات“ کا ایک جزو:

ظلم ساز ہے کوئی کلی کے پردے میں
سکوت چھپے پہر کا حیات سے لبریز
ہوا میں ایک بیک زمزمہ طرب انگیز
ستارے چونک پڑے جب ذرا پلک جھپکی
ہر ایک شے کو بے منزل سے اپنی آگاہی

چمن ہے ایک دل بے قرار، کیا کہئے
تمام محویت انتظار، کیا کہئے
کہ جیسے دور پہ ہو آتش، کیا کہئے
فضا میں پھیل گیا انتشار، کیا کہئے
بجز بزم کہ ہے گم کردہ کار، کیا کہئے

مرا جھڑکی خال اثر بی۔ اے۔

چند منتخب شعار : (فضل الدین اثر اکبر آبادی)

دیکھتا جاتا ہوں مُڑا مُڑا کر کے کیا کسی ہمدرد کی آواز ہے ؟
 زندگی برسیگی دنیا پر اثر آج میرے ہاتھ میں بھی ساز ہے
 یہ فریب ہو کہ ہو مصلحت، ہمیں اس سے کیا سروکار ہے وہ قرار بن کے جب آگے تو سمجھ لیا کہ قرار ہے
 اتنا تو ہوش ہے انھیں دیکھا تھا بے نقاب پھر اس کے بعد کچھ نہیں معلوم کیا ہوا
 شاید قریب تر ہیں رہائی کی ساعتیں میرے قفس پہ سارا چمن ہے جھکا ہوا
 پھول نہیں، صبا نہیں، برق نہیں، گھٹا نہیں آہ! اسیر فصل گل! کس سے تو ہم کلام ہے ؟
 اعتبارات محبت کی تسلی کے لئے اک فسانہ لکھ چلے ہیں تیرے سنگِ درپہم
 زندگی پھر اخذ کرتے ہیں سکوت مرگ سے شمع روشن کر کے پروانوں کی خاکِ ستر پہ ہم
 یہ تو نہیں کہ عشق غم افزا نہیں رہا غم تو رہا مگر غمِ دنیا نہیں رہا
 اب نہیں کچھ یاد کیا ہے شرطِ آدابِ وفا نالہ کرنا چاہئے یا ضبط کرنا چاہئے
 بغیر خواب وہ پھرنے لگے ہیں آنکھوں میں مذاق دیدہ بیدار دیکھتے جاؤ
 مرے نکیب کو تھا انتظار صبح ابھی چراغِ وقت سے پہلے بجھا دیا تم نے
 اثرِ تپھرے ٹکڑوں میں وہ چھپ کر بول اُٹھتے ہیں جہیں گھسنے پہ قدرِ سنگِ در معلوم ہوتی ہے

غزل : پر وفیسر شورشور

دل کی دہڑک سے بھی محبت اک سکون پاتی رہی سینے کی ہر نازک خلش جینے میں کام آتی رہی
 احساسِ غم بڑھتا رہا، اظہارِ غم ہوتا رہا افسانہ ہم کہتے رہے محفل کو نیند آتی رہی
 کانٹے بچھائے تھے جہاں پیغمبرانِ ہوش نے اُن سجدہ گاہوں پر محبت پھول برساتی رہی
 گم گشتگی شوق میں ایسا بھی اک عالم رہا دیر و حرم کو ہر نظر آئینہ دکھلاتی رہی
 اک روح پرور یاد سے ہر زخمِ دل رستار رہا اک نرم و نازک چاندنی پھولوں کو جھلساتی رہی
 طوفانِ رنگ و بو چمن زاروں سے اُٹھتا ہی رہا دل کی کلی بارانِ شبنم سے بھی تھراتی رہی
 اس شورشور ہر جہولہ فسانہ مجھ کو یاد آتا رہا
 اُس کی نظر ادراکِ دل اس طرح بکھراتی رہی

چند منتخب اشعار : (حسرت ترندی)

ساغر کا جس کو ہوش نہ ساتی کا ہوش ہے ایسا بھی میکرے میں کوئی بادہ نوش ہے
کچھ منحصر بیاں پہ نہیں التجائے دل ہر سانس، بازگشتِ صدائے خموش ہے

اپنی منزل کا پتہ اہل جنوں بھول گئے اس قدر بھی کوئی وارفتہ رفتار نہ ہو

کس لحظہ بے خبر میں رہا تیری یاد سے کس لمحہ اپنے حال سے غافل نہیں رہا
حسرت وہ غم نصیب گیا بھی تو کیا گیا جو اس کے التفات کے قابل نہیں رہا

درد کا درماں ہے، لیکن اس جنوں کا کیا علاج کہہ رہا ہوں ان سے کچھ، اور مدعا کچھ اور ہے
کیوں جنوں عشق کا الزام دیتے ہو ہمیں، سچ بتاؤ زندگی کا مدعا کچھ اور ہے
اس نے حسرت دو جہاں کے راز مجھ سے کہدئے راز حسن و عشق جب پوچھا کہا کچھ اور ہے

ماہر القادری کی تین غزلوں کا انتخاب

اُن کی نگاہِ مست سے مخمور ہو گئے اتنے ہوئے قریب کہ ہم دور ہو گئے
ماہر وہ آئے قسمتِ منزل چک اٹھی ذرے فروغِ نور سے معمور ہو گئے

اُٹھ کے خوابِ گراں سے آئے ہیں کیا بتائیں، کہاں سے آئے ہیں
دیرو کعبہ پہ کیا نظر ڈالیں ہم ترے آستان سے آئے ہیں

آج تک یاد ہے وہ لذتِ آغاز مجھے دیکھ! پھر دیکھ! نگاہِ غلط انداز مجھے
اس طرح دیکھ رہی ہے نگاہِ ناد مجھے جیسے آتے ہی نہیں ضبط کے انداز مجھے
آج تک سازِ محبت کے ہیں پردے خاموش دے گئی روزِ ازل آخری آواز مجھے